

# JAMIA COLLEGE



JAMIA MILLIA ISLAMIA  
NEW DELHI  
LIBRARY

Class No 111.9

Book No 118

Accession No ~~111.9~~ 9424

**Checked-1970**

# روح کلام غالب

غزلیات غالب  
ہم کی شعری تشریح

مصنف

مترجم

سید افتخار حسین زریں غالب ثانی مرا عزیز میگھڑا مرا مروت

شائع کنندہ: نشریات ادب ایکڈمی

بازار نمنا سہارن پور یو پی

۱۰ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت اول :- ۱۹۳۵ء ۱۰۰۰

اشاعت دوم :- ۱۹۶۸ء ۱۱۰۰

قیمت مجلد :- تین روپے

کاتب :- عبدالمنان خوشنویس سہانپور

زیر اہتمام :- سید عزیز حسن نسیم جلال آبادی

نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند میں چھپی

ناشران ۹۶۰۰۰۰۰۰

نشریات ادب ایکڈمی بازار نخاسہ سہانپور

# تعارف

غزالیاب کی تصانیف میں ان کے دیوان اردو کو ہر زمانہ میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے اور آج بھی مرزا کا درجہ سخنوری ہر طرح کی توصیف و تعارف سے بے نیاز ہے، یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۶ء سے ایک مرزا کے دیوان کے لاتعداد ایچے اور برے، سادہ و مہرکار نسخے شائع ہوتے رہے ہیں، اور یہ سلسلہ یہیں پر بس نہیں ہو جاتا بلکہ شاعرین و اہل قلم نے غالبیات کو ایک مخصوص ادبی موضوع بنالیا ہے۔ مختلف ادوار اور محققین نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کلام غالب کو نئے نئے انداز سے پیش کیا ہے اور آج کلام غالب پر گرانمایہ کتابیں وجود میں آگئی ہیں!

روز روشن کی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ کلام غالب پر جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان میں مولانا حالی کی ”مادگار غالب“ اور مولانا محمد حسین آزاد کی ”ابحیات“ کلام غالب کی قدر و منزلت کے عالیشان قہر کی سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں اسی سلسلہ کی ایک کڑی جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہا پنپوری کی شاہکار کتاب ”روح کلام غالب“ بھی ہے۔

”روح کلام غالب“ کے فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کی تمام غزلوں کی تفہیم کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھینچ کر صغہ قرطاس پر منتشر کر دی ہو۔ یہ کتاب غالب کے کلام کی زبان شعری مکمل شرح ہے جس سے غالب کے اشعار کا مفہوم غالب کے ذہن میں کیا تھا بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا نے ۱۹۲۶ء میں یہ کتاب مکمل کر دی تھی لیکن جس طرح

مرزا غالب اپنی حیات میں خود اپنا دیوان شائع نہ کر سکے بالکل اسی طرح مرزا سہارن پوری بھی ”روح کلام غالب“ اپنی حیات میں زیور طبع سے آراستہ نہیں کر سکے بہر حال کتاب شائع ہونی تھی اور ہوئی مگر مرزا صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۲۵ء میں ”روح کلام غالب“ زیور طبع سے آراستہ ہو کر کچھ ہی دنوں میں نایاب ہو گئی اور شائقین اس کے مطالعہ کیلئے تڑپتے رہے۔

اب جناب مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کے وارثان کی کرم فرمائی سے نشریات ادب اکیڈمی سہا پور کو اس نادر و نایاب شاہکار کو دوبارہ شائع کرنیکی سعادت نصیب ہوئی۔ ارباب اکیڈمی جناب مرزا حمید بیگ صاحب اور جناب مرزا سلطان بیگ صاحب وارثان مرزا سہا پور کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے شائع کرنیکی اجازت مرحمت فرمائی۔

”روح کلام غالب“ میں کچھ دلچسپ اور ضروری حاشیوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے وہ یہ کہ جن اشعار کی مرزا غالب نے خود تشریح کی ہے دلچ کر دی گئی ہے اور اکثر مشکل اشعار کے مطالب بھی تحریر کر دیئے گئے اسکے علاوہ ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جس میں مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا مرحوم کی وہ تفسیریں جو انھوں نے مولانا جامی، میر وحید گلکنوی، اور مفتی حبیب الدین سوزاں کے کلام پر کی ہیں اور غیر مطبوعہ بھی ہیں شائع کر دی گئی ہیں۔

میں ان ارباب ادب کا نہایت ممنون ہوں جن کی ادبی کاوشوں کے نتیجے ترتیب حواشی میں میرے زیر مطالعہ رہے ہیں ان میں جناب پرتھوی چند رمولف، مرقع غالب، کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

سید افتخار حسین زیدی

۱۵ جنوری ۱۹۶۸ء

## مقدمہ طبع دوم

(حکیم مشرف مظاہری سہارنپوری)

غالب کا یہ اپنا خیال نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ جسے آدمی بجائے خود اک عمر خیال اور اسی بنا پر وہ غلوت کو بھی انجمن سمجھتا اور بنا لیتا ہے لیکن کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جو اپنی پہلو وار خصوصیات اور حیرت طراز فطرت کی بدولت بجائے خود ایک انجمن ہوتی ہیں۔ انھیں لوگوں میں غالب بھی ہیں جن کی نظم نما مشورا اور گونا گوں کمالات میں محصور شخصیت فرد احمد کی نہیں بلکہ ایک وسیع ادارے اور قابضہ اکیڈمی کی حیثیت رکھتی ہے۔

اسد اللہ خاں غالب کے اشعار الہامی قسم کے ہوں یا اہمالی۔ طرز بیان ہو یا تشبیہات و استعارات۔ فصائد ہوں یا خطوط فلسفہ ہو یا تصوف۔ مذہبی مسائل ہوں یا اخلاقی قدریں سب میں انفرادی شانِ صحت مند حیرت۔ دل کش آن بان اور آزاد روی ہے اور بلاشبہ اردو شاعری و نثر نگاری کے طویل و عریض میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ————— عرفان غالب کے سلسلے میں مولانا حالی اور ان کے بعد اکثر قدما و اصحابِ علم نے بہت کچھ لکھا ہے مگر گزشتہ نصف صدی کے دوران جس تسلسل۔ قرینہ۔ محنت۔ علوم اور لگن کے ساتھ کام ہوا ہے وہ کافی حوصلہ افزا اور لائقِ مدحِ تحسین ہے۔ اور یہ اہم سلسلہ قاضی عبدالودود۔ مولانا اقبال علی حسینی۔ مولانا غلام رسول جہر۔ آل احمد سرور۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی۔ خواجہ احمد فاروقی۔

مالک رام ایم اے۔ پروفیسر حمید احمد خاں۔ مولوی ہمیش پرشاد، عبادت بریلوی۔  
 رشید احمد صدیقی۔ شوکت بزرگوری۔ ظانصاری۔ پرتھوی چندر اور کوثر جہان پوری  
 وغیرہ حضرات کے طفیل جاری و ساری ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف یہ کہ غالب غالبیات  
 سے متعلق نہایت اہم سرمایہ معلومات جمع ہو گیا ہے بلکہ ضمناً شاعری۔ فلسفہ حیات  
 نفسیات انسانی اور فن تنقید کے تحت اردو ادب میں معتد بہ افادی مواد کا اضافہ  
 ہوا ہے اور ان دونوں امور کا ثمرہ تازہ اور مسرت آگے پہلو یہ ہے کہ اب دوسری  
 زبانوں اور دوسرے ممالک کے محققین و اہل قلم بھی مطالعہ غالب اور اردو ادب و  
 شاعری میں دل چسپی و انہماک سے حصہ لے رہے ہیں۔

**تضمین کلام غالب** :- رباعی کی طرح تضمین بھی اپنے تقاضوں کے  
 لحاظ سے مشکل ترین صنف ہے خصوصاً کسی دوسرے شاعر کے کلام کو تضمین کرنا۔  
 کیوں کہ اس میں اصلی شعر کے اقدار کو برقرار ہی نہیں رکھنا پڑتا بلکہ کہیں ردیف اور  
 کہیں ردیف و قافیہ دونوں کا پابندی کرنا پڑتا ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم  
 مقصود کلام کو نئے انداز سے نکھارا جاتا اور بیان کو زیادہ موثر بنانے کے لئے مزید  
 دلائل و تشبیہات سے وسعت دی جاتی ہے۔ یہ صنف کتنی مشکل ہے اس کا محکم  
 جواب اور قاطع ثبوت میر مہدی قزوینی ایسے قادر الکلام و باصلاحیت شاعر اور  
 غالب کو تضمین کرنے کا بیڑا اٹھایا لیکن چند کام چلنے کے بعد ہی انھوں نے محسوس  
 کر لیا کہ اس کوہ کئی میں جا قدم قدم پر مٹے نفس نفس پر امتحان ہیں۔ نیز اس

تضمین کلام غالب کے لئے یہ موصوفیہ کلام



عرصے میں انھوں نے جو کوشش کی تھی اس کے نتیجے پر جب ناقدانہ نظر ڈالی تو اس کو کسی درجے میں بھی اہم قرار نہ دے سکے اور خیال کیا کہ اگر فکر و تئیر فرما دے کلام کے یہ جوئے شیر مکمل بھی کر لی تب بھی وہ شیریں کے حصول کا حامن کامیابی ذریعہ ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا یہ سوچ کر کہ قلم مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔

اس معرکہ عظیم کو برسرِ کئے کا خیال ترک کر دیا۔ اس نا کافی عزم اور شکستِ بہت کو ہم میر جبرجوع کی باصلاحیت شخصیت کی نقیص پر دال نہیں سمجھے کیونکہ بلاشبہ وہ اس کلام کے اہل بھی تھے۔ ان کا ارادہ نیک بھی تھا اور کلام غالب کی شرح کے لئے ان کی نگاہ انتخاب نے موزوں ترین راہ بھی اختیار کی تھی مگر قدرت اس کارنامے کا سہرا کسی اور ہی کیلئے مقدر کر چکی تھی اس لئے میر جبرجوع کا خواب شرمندہ تعمیر نہ ہو سکا۔

**روح کلام غالب** :- میر جبرجوع کے بعد غالب کے وسیع حلقہ شاگردان میں نہ جانے کتنے اصحاب کے دلوں میں اس آرزو نے طوفان بپا کیا ہو گا مگر یہ قرۃِ فال غالب کے پوتا شاگرد مرزا عزیز بیگ صاحب مرزا سہارنپوری (تمیذ حضرت سوزاں) کے نام نکل چکا تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے بصورتِ احسن یہ حق ادا کیا۔ کلام غالب کی تشریح و توضیح میں غالب کے توانا طرزِ فکر اور حسنِ ادا کو ایک چابکدست مصور اور دقیقہ رس فنکار کی حیثیت سے مزید دلاؤ و نیروی و نگینی عطا کی اور ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی اردو، فارسی اور ہندی شاعری کی طویل تاریخ اب تک نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے اور جس پر اردو شاعری اور غالب نواز حلقہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

رکھیں غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف جس وسیع پیمانے پر اور بالغ نظری سے غالب و غالبیات پر اہل قلم حق تنقید و تحقیق ادا کر رہے ہیں اور غالب سے متعلق معمولی سے معمولی واقعے کو منظر عام پر لا رہے ہیں اس اعتبار سے یہ امر انتہائی حیرت زار اور باعث افسوس ہے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی ”روح کلام غالب“ کو بجائے اسکے کہ اسکی کا حق قدر افزائی ہوتی اس کے ساتھ بے اعتنائی و بے نیازی کا وہ منظرہ کیا گیا ہے کہ غالبیات کا مطالعہ کرنے والے طبقے میں چند فیصد بھی اس سے واقف نہیں اور اس بے رحمانہ عدم التفات کے طفیل یہ پیکر خوبی ج

آفتاب لیکن اثر سحر نازد

حرف آخر۔ نظامی صاحب کے مقدمے میں آپ میر خورشید اور رضا ”روح کلام غالب“ کی تفہیموں کا موازنہ ملاحظہ فرمائیں گے اسلئے میں اس سے صرف نظر کر کے اس سلسلے کی سب اہم کڑی اور تفہیم کا ایک نایاب نمونہ پیش کرتا ہوں یہ تفہیم مرزا غالب نے شاہ ظفر کی غزل پر کی ہے جو ۱۷ اپریل ۱۸۵۷ء کے ”اردو اخبار دہلی“ میں شائع ہوئی تھی اس تفہیم سے بخوبی واضح ہو جائیگا کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم کی تمام تفہیموں کا معیار و وزن کیا ہے؟ اور کیا ”روح کلام غالب“ اردو ادب میں مقام رفیع پانے کی مستحق نہیں؟ اور کیا یہ تصنیف نادرہ ماضی کی طرح اب بھی گمنامی و بے اعتنائی کی نذر ہو جائے گی۔

## غزلِ ظفرِ تضمینِ غالبؔ

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیرِ آدمی رہ گئی      مرگئے پر قبر کی تعمیرِ آدمی رہ گئی  
سب ہی پڑھتا کاش کیوں بکیرِ آدمی رہ گئی      کھینچے قاتل جب تری شیرِ آدمی رہ گئی  
غم سے جانِ عاشق دگرِ آدمی رہ گئی

بیٹھ رہتا ایسے چشمِ پرِ غم اس کے روبرو      کہوں کہا تو نے کہ کہہ کا غم اس کے روبرو  
بات کرنے میں لگتا ہے دم اس کے روبرو      کہہ سکے ساری حقیقت ہم نہ اس کے روبرو  
ہم نشیں آدمی ہوئی تقریرِ آدمی رہ گئی

تو نے دیکھا مجھ کیسی بن گئی اے رازدار      خوابِ بیلاری پر کب ہو آدمی کو اختیار  
مثلِ زخمِ آنکھوں کو سی دیتا جو ہوتا ہوشیار      کھینچتا تھا رات کو بس خواب میں تصویرِ یار  
جاگ اٹھا جو کھینچنی تصویرِ آدمی رہ گئی

غمنے جب گھیرا تو چاہنے یوں دلنواز      مستی چشم سیرِ چل کے ہوئیں چارہ ساز  
تو صلائے پاس جاگتا جو خواب ناز      دیکھتے ہی اے سنگت تیری چشم نیم باز  
کی تھی پوری ہم نے جو تیرا دھمی رہ گئی

اس بت مغرور کو کیا ہو کسی پر التفات      جسکے حسن روز افزوں کی لک ادا نے ہر بات  
ماہِ نوکلے پر گزری ہونگی راتیں پان سات      اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک سہ ہستی رات  
تابشِ خورشید پر تنویرِ ادھی رہ گئی

تا چھپ چھپائے کاش بخت بابر گھات میں      ہاں فراوانی اگر کچھ ہو تو ہے آفات میں  
جرمِ وِج وِلم گھٹا ہے ہر اک بات میں      کم نصیبی اسکو کہتے ہیں کہ میسے بات میں  
آتے ہی خاصیت اکسیرِ ادھی رہ گئی

سب بیگوں کو شہ کدے پر گلے لگ جاوے      آدمی کو کیوں پکائے ہو گلے لگ جاوے  
کسے گر چادر اتارے ہو گلے لگ جاوے      مانگ کیا بیٹھا سنوئے ہو گلے لگ جاوے  
وصل کی شب لے بت بے پیرِ ادھی رہ گئی

میں یہ کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے      پر نصیب پنا انھیں جاتا سنا جوں پھر گئے  
 دیکھنا قسمت وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے      آگے آدمی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے  
 کیا کشش میں دلی اب تصویرِ آدمی رہ گئی

ناگہاں یاد آگئی ہر جھکویا رب کب کی بات      کچھ نہیں کہتا کسی دین ہا ہوں سب کی بات  
 کسلے تجھ کو چھپاؤں ہا وہ پریشانی کی بات      نامہ بر جلدی میں تیری وہ جوتی مطلب کی بات  
 خط میں آدمی ہو کی تحریرِ آدمی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں ہر سببی غضب      ہاں کچھ گھنٹے کی ہوتی فرصتِ عیش و طرب  
 شام سوائے تو کیا اچھی گزرتی رات سب      پاس میسے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب  
 نکلی آدمی حسرت لے تقدیرِ آدمی رہ گئی

تم جو فوٹے ہو دیکھ لے غالباً شفتہ سر      ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے گی کیوں اسکے گھر؟  
 جان کی پاؤں ماں باتیں سپہ ہیں مگر      دل نے کی ساری خرابی لیگیا مجھ کو ظفر  
 واں کے جانے میں مری تو قیرِ آدمی رہ گئی

محبِ مکرم جناب سید افتخار حسین صاحب زیدی ناظم نشریات  
 ادب اکیڈمی اور سید عزیز حسن نسیم مدیر دیر و حرم سہارنپور لائقِ صد  
 مبارکباد ہیں کہ اس دورِ ابتلا و گمراہی میں روحِ کلام غالب کو حیاتِ  
 نو سے بہرور کرنے اور علمِ دوست اصحاب تک پہنچانے کے نیک  
 جذبے سے اس کی طبعِ دوم کے لئے کمرِ ہمت باندھی۔ ع  
 ”خدا نصیب کرے انکو عشرتِ منزل“  
 آمین

## مقدمہ

(از مولوی نظام الدین حسین صاحب نظامی بدایونی)

میرے دوست مرزا محمد ظفر بیگ صاحب جی کے حسن سعی سے ”روح کلام غالب“ طبع ہو کر آج شائقین کے پیش نظر ہے۔ مجھ سے مہر ہوئے کہ میں اس کا مقدمہ لکھوں غالباً ان کا یہ اصرار اس بنا پر تھا کہ مجھے کلام غالب سے دلی لگاؤ رہا ہے اور اس کے فدائی ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میری گونا گوں مصروفیتیں کچھ عرصہ تک مرزا صاحب کی تعمیل ارشاد میں مانع رہیں۔ جب تقاضا صبر سے بڑھا تو کچھ وقت اس کے لئے بھی نکالا۔ میں نے اس مقدمہ میں اختصار کو مد نظر رکھا ہے تاکہ ناظرین آسانی سے اس کے مطالعہ کے لئے وقت دے سکیں ورنہ کلام غالب کا موضوع اسی قدر دل چسپ اور وسیع ہے کہ اس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ غالب غزل کا بادشاہ تھا اس نے اس صنف سخن کی مابہیت کو خوب سمجھا ہے۔ غزل کی تعریف مختصراً یہ ہے کہ اس میں جتنے مضامین ہوں وہ داخل ہوں اور ان کا درجہ اس قدر بلند ہو کہ ان سے انسان کی فطرت اور اس کی عظمت ہو پیدا ہو سکے اور اس کی وسعت ادراک کا پتہ چل سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ جہلاً صناف سخن میں غزل گوئی جتنی آسان ہے اتنی ہی دشوار ہے اگر غزل غزل ہو تو اس کو بوستان نظم کا ایسا قطعہ کہنا چاہیے جسکی روشیں

---

مذہب معبود جنگ مرزا صاحب جی۔ اے آکس کی تحریک سے سب سے پہلے ۱۹۱۵ء

میں میں نے اردو دیوان غالب معری اشارات اطالی کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے (باقی آئندہ)

غیر مسلسل اور نامرغوب ہونے کے باوجود بے حد دل کس اور روح افزا ہیں۔ جس طرح آسمان پر چمکنے والے تاروں کی بے ترتیبی ان کی خور آفرینیوں کو جلا دے دیتی ہے اسی طرح ایک بہترین غزل کے منتشر استعار اس کے حسن کو دو بالا کر دیتے ہیں اور یا اس ہم نامرغوبی کے لیے لفظ ”گل جلد پیدا لڈید“ کا مصداق بن جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سر شعر نئی تخیل کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخیل میں نئی نئی نکتہ آفرینیاں ہوتی ہیں۔ کہیں فلسفہ اخلاف و تصوف کے گاماگوں رموز عالم حیرت استعجاب طاری کر دے ہیں تو کہیں جذبات حسن و محبت کی بولبولی مسخو روئے خود بنادیتی ہے۔ غالب کے دیوان کو شروع سے آخر تک بڑھ جائے اس کا ایک ایک شعر اس معیار پر پورا اترے گا۔ یہ ہی وجہ ہے کہ غالب کا کلام جب پڑھئے سیا لطف آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے کام میں اکثر استعار نثری طلب ہیں۔ اسی لئے اس کی متعدد و شہرہ لکھی گئیں جن میں طرح طرح کی مونسگافیاں کی گئی ہیں یہ بحث ہمارے موضوع سخن سے خارج ہے کہ یہ نثر و روح و جوانمندی اپنے مقاصد میں کہاں تک کامیاب ثابت ہوئے لیکن یہ امر مسلم ہے کہ غالب کے سوا زبان اردو کے کسی اور شاعر کے کلام کو یہ شہرت اور اہمیت اب تک نصیب نہیں ہوئی۔ اور نہ صرف اس لحاظ سے بلکہ دیگر خصوصیات شعری کی بنا پر آج ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم دنیا کی دیگر مشہور زبانوں کے نامور اور عالمگیر شہرت رکھنے والے شعراء کے مد مقابل غالب کو پیش کر سکتے ہیں چنانچہ گزشتہ ستر سال زمانہ میں اس کے کلام کی خوبیوں کو جس بلند آہستگی کے ساتھ سراہا گیا ہے اور اس کی مدحت طرازی کی گئی ہے اس کے ثبوت کے لئے

گزشتہ سے پچھلے، شائع کیا اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں سلسلہ آصفیہ کی پہلی کڑی کے طور پر شروع ایڈیشن شائع ہوا۔ میری یہ شرح تعلیم یافتہ طبقہ میں اس قدر مقبول ہوئی کہ اس کے پانچ ایڈیشن اس وقت تک نکل چکے ہیں۔ (نظامی)



ان ضخیم خرموں کے علاوہ ملک کے نامور مصور جیتائی کا دیدہ زیب "مرقع" اور دیگر قسم قسم کے خوبصورت اور نظر فریب ایڈیشن موجود ہیں۔

کلام غالب کی قدر و منزلت کی یہ عالی شان عمارت جس کا سنگ بنیاد مولانا حالی مرحوم نے انیسویں صدی کے آخر میں "یادگار غالب" لکھ کر رکھا تھا آج "روح کلام غالب" کی اشاعت سے پایہ تکمیل کو پہنچ رہی ہے کسی شاعر کے ۱۰۰ بات کچھ کم قابل فخر نہیں کہ دیگر شعراء اس کی دوچار چیدہ ہزاروں کے اشعار پر مصرعہ رئیس اور ان کی تصنیف کر کے اپنے کلام میں شامل کر لیں لیکن اردو کیا فارسی میں بھی کوئی شہرہ نامی شاعر غالباً ایسا نہیں ہوا جس کے پورے دیوان کی تصنیف کی گئی ہو۔ کلام غالب کی قدرا فرائی میں یہ ہی ایک کمی تھی جس کو "روح کلام غالب" (جو غالب کی تمام غزلوں کی تصنیف ہے) بدرجہ اتم پورا کرے گی اور اس لحاظ سے غالب کے توصیفی لٹریچر میں اس کو ایک قابل قدر اور شاندار ادبی اضافہ شمار کیا جانا چاہیے۔

اردو ادب میں تصنیف کا رواج دراصل فارسی کا اتباع ہے اردو میں فارسی غزلوں کی بھی تصنیف کی جاتی ہے اکثر شعراء خود اپنی غزل کی بھی تصنیف کرتے ہیں۔ یہ تصنیف دو قسم کی ہوتی ہے مثلث اور مخمس۔ مثلث میں اول مصرعہ تصنیف کا ہوتا ہے اور دو مصرعہ اصل نزل کے جس کی تصنیف کی جائے۔ مخمس پانچ مصرعوں سے مراد ہے جس میں تین مصرعہ تصنیف کے ہوتے ہیں اور دو اصل نزل کے۔ اب زیادہ تر مخمس کا رواج ہے۔ مرزا عزیز بیگ مرحوم مصنف (روح کلام غالب) نے بھی مخمس ہی کو پسند کیا ہے یعنی غالب کے قصائد وغیرہ چھوڑ کر ہر غزل کے اشعار پر تین مصرعہ اپنے چسپاں کئے ہیں۔

تصنیف کی صرف یہ ہی خوبی نہیں کہ اس کے مصرعے اصل مصرعوں سے درست

مگر یہاں ہو جائیں بلکہ ان سے اصل شعر کے معانی اور مطالب کو خواہ وہ کتنے ہی دقیق اور  
 لائیل ہوں اس لطافت کے ساتھ نمایاں کر دیا جائے کہ پوری تفہیمیں ایک ہی دل و دماغ  
 کی شاعرانہ کاوشوں کا نتیجہ معلوم ہو۔ روح کلام غالب میں یہ تمام محاسن پوری طور پر نظر  
 آتے ہیں لیکن چونکہ اول سے آخر تک ہر غزل کی تفہیمیں کی گئی ہے اس لئے اگر کہیں کہیں  
 یکساں زور و قلم نسبتاً نہ پایا جائے تو انشاؤں کا مجموعہ کی بنا پر نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔  
 واقعہ یہ ہے کہ مصنف نے پورے دیوان کی تفہیمیں کرنے میں اپنی پوری قوت شاعر  
 صرف کر کے کلام غالب کی حزاب کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس کی ادنیٰ خصوصیت یہ ہے کہ  
 مشکل ترین اشعار کے معانی اور مطالب اس درجہ واضح ہو جاتے ہیں کہ کسی شرح کو درمیان  
 کی ضرورت باقی نہیں رہتی اس لحاظ سے روح کلام غالب کو دیوان غالب کی تمام شرحوں  
 پر فوقیت حاصل ہے اور اس کا اندازہ صرف اتنی بات سے ہو سکتا ہے کہ غالب کے جن  
 مشکل اشعار کی شرح میں دیگر شارحین نے نثر میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیئے ہیں ان کو  
 مصنف روح کلام غالب نے نظم کے صرف تین مصرعوں میں اس فصاحت و بلاغت  
 کے ساتھ لکھا۔ یا ہے کہ ہم اس کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور  
 بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے۔ ع

### آفتاب آمد دلیل آفتاب

غالب اس کی تہ جیہ یہ ہو سکتی ہے کہ غالب اور مرزا صاحب مرحوم دونوں فطری  
 شاعر تھے۔ مرزا مرحوم خوب بھی ایک درد مند دل رکھتے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے  
 غالب کی سیرت اور ماحول کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مختصر یہ ہے کہ جو درد غالب کے کلام میں  
 ہے اسی کی کسک مرزا کی طبیعت میں بھی موجود تھی خواہ حافظ نے خوب فرمایا ہے کہ

نال بلبل اگر بامنت سریارِ رست      کہ ماد و عاشقِ زارِ کم و کاہِ زارِ رست  
 جب دو در در سیدہ چوٹ کھائے ہوئے دل ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور ایک  
 دوسرے کو اپنی داستانِ غم سنا تلبے تو سننے والوں پر ایک کیفیت کا عالم طاری ہوتا ہے  
 یہی حالت اس تضمین کے مطالعہ سے ناظرین کے دلوں پیدا ہوتی ہے فرماتے ہیں :-  
 ذرا اس بے زباں دل کی صدا سن      کچھ اپنی قدر دانی کا گلشن  
 یہ لعلِ بے بہا کہتا ہے کیا سن      سن اے غارت گرِ جنس و فائن  
 شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا  
 اس ابی آرزو پر مر مٹا ہوں      کہ نصب العینِ چشمِ سرمہ سا ہوں  
 ہم تن شوقِ نظارہ ہوا ہوں      لگا رہے محابا چاہتا ہوں  
 تنِ فلہائے نکیس آزما کیا

ترا خیال و تصورِ ہر دل کو ہے محبوب      اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب  
 مجھے امیدِ کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب      رہ جاتا ہوں کہ تو اور یا سخنِ مکتوب  
 مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ عامِ فرس کا  
 کیا خوب شرح کی ہے ۵

جنوں مانع ہوا استاد کا احسانِ ٹھانے سے      فراغت پا چکا روزِ ازل پڑھنے پڑھانے سے  
 رہا انکارِ عقل کل کو غیر لا بتانے سے      فنا تعلیمِ درسِ بینہ و دی ہوں اس زمانے سے  
 کہ مجنوں لام الف کلمتا اتحادِ دیوارِ بستان پر

ایک مقطع کی تضمین ملاحظہ ہو جس میں غالب نے بوڑھاپے کا رونا روایا ہے ۵

کچے مرزا کا حال کیا غائب      بے طرح ضعت ہو گیا غائب  
ہے یہ پیری بھی کیا بلا غائب      مضمحل ہو گئے قوی غائب

وہ عناصر میں اقتدرال کہاں

غائب کے ایک شعر کی جس میں نوحید کا فلسفہ کوٹ کوٹ کر بھر ہے نصیبین کے  
تین مصرعوں میں ایسی شرح کی گئی ہے جس سے شاعر کا مافی الصمیم صاف سمجھ میں آ جاتا ہے  
لکھتے ہیں ۱۔

ہیں موصوفہ بخدا شرک ہر دل سے مفقود      ہم معبود ہیں نہ کعبے کے نہ کعبہ معبود  
رو بہ قبلہ میں تو صرف ایک جہب ہر مقصود      ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود  
قبلہ کو اہل نظر قبہ مہمسا کہتے ہیں

غالب نے ایک شعر میں معشوق کے وصال کا ذکر کر کے عاشق کی خوش نصیبی  
انوکھے طرز سے ثابت کی ہے جس میں زلفوں کی پریشانی کو شب وصال میں لطف  
کا سبب ظاہر کیا ہے اور اسی طرح رات کی اور زلفوں کی سیاہی کی مناسبت فروغ  
گئی ہے نصیبین نگار نے اس میں چار یا ندر لگا دیئے ہیں کہتے ہیں۔

ہم میں جو ہمیشیں تیرا رانیں اسکی ہیں      صبح نظارہ میں کر دیتا ہے رانیں اسکی ہیں  
اس کو بھی وہ خوش نصیب ہے ہر رانیں اسکی ہیں      نیند اسکی ہے دماغ اسکا ہر رانیں اسکی ہیں  
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشانیں ہو گئیں

ایک شرح طلب شعر کی منقولہ ترجہ ذیل کی نصیبین میں ملاحظہ ہو۔

ہنسی یاروں نے کیا کی اک نصیحت مجھ کو فرمائی      نہ اب ہوش و حشرت ہر طرف ناگھیلیاں  
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامان رسوائی      نکو ہوش مانع بے ربطی شور جنوں آئی

ہوا سے خندہ اجباب بخیر حیب و دامن میں

جب غالب دہلی سے کھنڈو کے سفر کے لئے اس امید پر نکلے کہ نواب اودھ کی بارگاہ سے کچھ امداد لے کر بخت اشرف اور حرم محترم کی زیارت سے بہرہ اندوز ہوں گے تو راستہ میں ایک غزل لکھ کر ان جذبات کا اظہار کیا اس غزل کے دو شعروں کی تضمین قابل ملاحظہ ہے کس ثوبی سے واقعات کی تصویر کھینچی ہے۔

سقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دہلی کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی  
یک بیک چوڑی کیوں لغت راحت کھر کی نکھو آئے کا باعث نہیں کھلا یعنی

ہو بس بیرون تانتا سودہ کم ہے ہم کو

جب چلے گھر سے تو تھی دلی میں بہاؤ کی لہر بیٹھ رہنا یہیں اور ترک سفر ہے اک قہر  
قصد ہے دور کا مانع بحر نہ ہو گردش دہر مقطع سناہ شوق نہیں ہے ہر شہر

عزم سیر بخت و طوف حرم ہے ہم کو

غالب نے اکثر موقعوں پر اپنے دقیق مطالب کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں عوام اس کو نہیں سمجھتے اور یہ ان کی فہم کا تصور ہے۔ اس منسوب کے ایک شعر کی تضمین ملاحظہ ہو۔ کیا خوب کہا ہے۔

میری غمنواری پر عبث قیل وقال ہے مطلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے  
کہتا ہوں سب کچھ اوزبان میری لال ہے گر خامشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھی مجال ہے

غالب کے دیوان میں جہاں مشکل اشعار ہیں وہاں ایسے بھی شعر ہیں جو سہل متنوع کا حکم رکھتے ہیں ایسی غزل کے ایک شعر کی تضمین نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہو جس میں

تفصیل کی زبان بھی مرزا غالب کی زبان سے مل گئی ہے۔

ملاو آہ میں دھرا کیا ہے حاصلِ گریہ و بکا کیا ہے  
اس ترپنے سے مدعا کیا ہے دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

آخر اس درو کی دوا کیا ہے

سطور بالا میں تقریباً غالب کے ہر قسم کے اشعار کی تفصیل کے نمونے پیش کر دیئے  
ہیں تاکہ ناظرین ”روحِ کلامِ غالب“ کی خوبوں کا صحیح طور پر اندازہ کر سکیں اور ان کو معلوم  
ہو سکے کہ مرزا عزیز بیگ مرحوم نے غزل کے تنگ میدان کو مخمس بنا کر وسعت دینے میں  
کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے اور غالب کی اس آرزو کو کہ ان کے بیاں کی وسعت  
کے لئے تنگنائے غزل سے زیادہ وسیع میدان درکار ہے کس حد تک پورا کیا غالب کے  
اسی مضمون کے شعر کی تفصیل میں نہایت موزوں اسلوب اختیار کیا ہے فرماتے ہیں :-  
سخن میں چاہیئے کوئی جدید طرزِ عمل کہ طبع تیز کا کچھ حوصلہ تو طبعِ نکل  
نہ کیوں ہو قدرِ تغزل میں رکے گی ہیکل بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل  
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

مرزا مرحوم کی تفصیل کے متعلق اس قدر رکھنے کے بعد ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دوسرے  
شاعروں نے جو غالب کی بعض غزلوں کے حصے کئے ہیں ان کے مقابلہ میں مرزا مرحوم کی  
تفصیل کا کیا درجہ ہے مثال کے طور پر میر جہدی مجروح دہلوی کے خمسوں کو جو غالب  
کے ارشد تلامذہ میں سے تھے مرزا مرحوم کے خمسوں کے بالمقابل درج کرتے ہیں مبصر اور  
ناقدان کو پڑھ کر خود رائے قائم کریں :-

## مرزا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا  
 کم مرض ہی مگر ذرا نہ ہوا  
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا  
 درد منت کشش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 ہو گے رسوا تمھیں کہا مانو  
 بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو  
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا  
 اور تجھ ساحیں کہاں سے لائیں  
 حسرت دل کی داد کس سے پائیں  
 کس کے ہاتھوں کو نرم دل پر رکھائیں  
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا  
 سخن تلخ کب ہے ان کے قریب  
 ان سے باتیں سننے یہ کس نصیب  
 ہے خلاوت ہی کچھ سخن میں عیب

## بحرِ جوح

کام نخواست سے کچھ روانہ ہوا  
 در حاجت کسی پہ وا نہ ہوا  
 کیا حقیقت کہوں کہ کیا نہ ہوا  
 درد منت کشش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہو  
 دے نہ راحہ ان حبیبوں کو  
 کہ جلائیں نہ بد نصیبوں کو  
 رنج دیتے ہو ہم غریبوں کو  
 جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا  
 کیوں عبت جا کے ایسا سر ٹکرائیں  
 ناسحق احسان کیوں کسی کا اٹھائیں  
 اس سے جب آرزوئے دل ہی نہ پائیں  
 ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
 تو ہی جب خیر آزمائے نہ ہوا  
 رکھنا لذت جو ہے دہان جیب  
 شہر مہری کو وہ کہاں ہے نصیب  
 کیا کہوں بات ہے عجیب غریب

## بحرِ حُجُوج

کہتے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب  
 گالیاں کھا کے بے مزاد نہ ہوا  
 فکر کی قسمت آزمائے کی  
 یعنی اس شوخ کو بلائے کی  
 یہ سنو بات دل حلائے کی  
 ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
 آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
 جب سے عقل و تمیز آئی تھی  
 تیرے ہی در پہ جب سائی تھی  
 دم بدم عاجزی فدا کی تھی  
 کیا وہ نمرود کی خدا کی تھی  
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 اس کی بخشش نے کی ذرا نہ کی  
 کچھ تلافی پہ ہم سے ہونہ سکی  
 کیا بڑی بات ہم نے کی ایسی  
 جان دی دی ہوئی اسی کی تھی  
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
 ان کے جب بحرِ فکر بہتے ہیں

## مزرا

کہتے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب  
 گالیاں کھا کے بے مزاد نہ ہوا  
 جب ہیں دمِ تھی ان کے لائے کی  
 استطاعت تھی گھر سب لانے کی  
 اب جو بدلی ہوا زمانے کی  
 ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
 آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا  
 جانِ طاعت ہی میں کھپائی تھی  
 کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
 سر تھا سجدہ تھا جہ سائی تھی  
 کیا وہ نمرود کی خدا کی تھی  
 بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا  
 قابلِ فخر کیا ہے بات اپنی  
 عین احساں ہے اس کی خوشنودی  
 ہم نے اس پر نثار کیا شے کی  
 جان دی دی ہوئی اسی کی تھی  
 حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا  
 مثلِ مزرا مصر وہ رہتے ہیں



## مُجروح

ہم تو مجروح غرق رہتے ہیں  
آپ کیوں طعن خیز رہتے ہیں  
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج عتاب غزل سرا نہ ہوا

## ایضاً

لا تقنطو نوید ہے ام اکتاب میں  
تراہد گماہ خلق ہیں وہاں کس حساب میں  
ہے عرض یہ جناب تقدس مآب میں  
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں  
یہ سودا ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں  
گوازیئے دید میں بے قرار ہوں  
ہرگز وہ یا نہ آئیں گے میں کو طلب کرو  
پر کچھ تو شغل چاہئے میرا کیوں رہوں  
قامد کے آئے آتے خط اک اور لکھ کر چوں  
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں  
شادی و غم کو عشق میں اک ادھیا نہ ہے

## مرزا

جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹ پھتے ہیں  
سب غم انتظار سہتے ہیں  
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
آج عتاب حزل سرا نہ ہوا

## ایضاً

جام سو کو رکھ نہ بجا کر حساب میں  
شامل نہ کر مصوچی کو شرب کے حساب میں  
وہاں کچھ کی نہیں کہ ہو تو اہ ظراب میں  
کل کے لئے کہ آج رخت خراب میں  
یہ سودا ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں  
لکھ تو دیا اہیں کہ مرا حال ہے زبوں  
ہے ان سے آرزوئے تسلی نرا جنوں  
آگاہ انہی عادت و خصلت کو خوب ہوں  
قصد کے لئے آتے خط اک اور لکھ کر چوں  
میں جانتا ہوں جو وہ کہیں گے جواب میں  
وہ آج میرے گھر چلے آئے مست سے

اے ارنیٹا کی طوکت سے بدل کر اس کو مستہ واردات اوصیات کا، ہم قافیہ کرنا مزاحی غلطی ہے  
معلوم نہیں یہ غلطی کہاں سے شروع ہوئی ہے۔

## مخروج

اس میں کبھی حیات ہے گا ہے ممات ہے  
 ہے طرفہ حال اور نئی واردات ہے  
 میں اور حقا وصل خدا ساز بات ہے  
 جان ندر دینی بھول گیا اضطراب  
 حکم خدا میں گو لبہ چون و چرا ہے بند  
 مالک ہے وہ حقیر کرے خواہ سر بلند  
 پردہ دل تو اس خیال سے رہنہ ہو فکر مند  
 ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک نہ تھی پسند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 ہمدرد! قہر نے بیتِ خاند خراب کے  
 اوسان کھو دیئے دل بے مبروتاب کے  
 آثار ہم سمجھ گئے ان کے عتاب کے  
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہے اک شکن بڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
 اہل نظر سمجھتے ہیں عالم کا کیا وجود  
 ہے اس کی ذات پاک سے ہر چیز کی نمود  
 ہو ایک کو نہیں خبر نیستی و ہود  
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

## مرا

شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے  
 جاتے ہوئے وصال کا وعدہ بھی کر گئے  
 میں اور حقا وصل خدا ساز بات ہے  
 جان ندر دینی بھول گیا اضطراب  
 یا تو ملائکہ سے بھی تھا مرتبہ بلند  
 ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خواہ مستمند  
 پہونچا رہا ہے ہر متنفس ہمیں گزند  
 ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک نہ تھی پسند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں  
 جے پردہ کچھ اتر ہیں نمایاں عتاب کے  
 لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے  
 آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے  
 ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
 ہے اک شکن بڑی ہوئی طرفِ نقاب میں  
 اشیاء کی ہے تصویر انبیاء سے سب نمود  
 دیکھا جو غور سے تو خیالی میں رب وجود  
 ہستی کے واہنے کی بدولت ہر دست و پد  
 ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

## مخروج

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 میں لکھ جاں سے اپنی خدا اس پہ ہوں مگر  
 میری لذتوں سے خوشی ہے وہ فتنہ گر  
 ہے بار میرا دشمن آرام کس قدر  
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
 آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں  
 رکھتے ہیں گو نہاں وہ جمال نظارہ سوز  
 سالن زیب رہتا فراہم لگو ہے روز  
 نکلے سکھ سے تادوست رہے روئے دلفروز  
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
 تا ہوں نہ اس کو میرے اٹھانے میں اہتمام  
 منغل میں اس کی ہم نے نہ رکھا کسی کو کام  
 یاں تو صیف نعال میں رکھا سرد مقام  
 مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درجام  
 ساتی نے کچھ ملانہ دیا سو خراب میں  
 گر شوخیاں جتا کے ملانا نگاہ کا  
 گر خرمناک ہو کے پھر نا نگاہ کا

## منا

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 کیا کہئے ہوتی تھی شب غم کس طرح بھر  
 اختر شمار یوں ہی میں ہوتی تھی سحر  
 توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر  
 تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر  
 آئے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں  
 گو خود نما نہیں ہے وہ پر نقش ہنوز  
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
 ہے محو ناز خود بھی وہ ناتواں فرہ ہنوز  
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
 رہتے تھے ہم پیار جہاں سے خالص غلام  
 اٹھتا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام  
 پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام  
 مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا درخام  
 ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں  
 آتا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا  
 نظریں بجا کے سب کی ملانا نگاہ کا

## مَجْرُوح

انداز دلبری سے جھکا نا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جب تک کہ پھر خاص مقدر ہی کا نہ جائے

بنتا نہیں ہے کام کوئی لاکھ گر بنائے

اس بات کا یقین کوئی کس طرح سے لائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا اب میں

مقدر رنگ تو سہی میں یاں دست لپا ہلائے

پر کیا کریں ملا دی جب کوئی برز آئے

یہ حال ہو تو خاکِ نعت کا لطف آئے

وہ ناکہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

ملکِ عدم کے دیکھئے عازم پہ کیا بنے

اس رو میں ڈوبت ہیں سنب و فوار کے

یرخس میں بس ہی اپنا دھواں ہی کیا کرے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

## مَزرا

آفت ہے ان مگر نہ اٹھانا نگاہ کا

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا

لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اسکو عمل میں لائے

مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے

لیکن مجھے ہی تو ہے افسوس ہائے ہائے

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہوا اب میں

وہ نالہ جو کہ عریض معلے کو بھی ہلائے

وہ نالہ جو کہ میں کو بھی زلزلے میں لائے

وہ نالہ اور کانِ نکلاں میں جو کہ بجائے

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے

بسا نہیں عدم سے ادھر دم کہیں اسے

بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرا نہ دے

رو میں ہے رخسِ عمر کہاں دیکھئے تھمے

لے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں

## مخروج

مخروج کو اس امر سے ہے خوب اگہی  
اب وہ نہیں ہے بادہ پرستی جو پہلے تھی  
بالکل ہی ترک کرے ہو بہ ممکن نہیں ابھی  
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہشتاب میں

## مرزا

تھے یار ہم پیالہ ہمارے سبھی کبھی  
دیکھا نہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی  
وہ دن کہاں کہ شغل سے فرصت تھی کبھی  
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ہشتاب میں

**نوٹ:** جس مصنف کے کلام کا مطالعہ کیا جائے اس کے حالات زندگی کا جاننا بھی

خالی از دل چسپی نہیں ہوتا۔ مرزا محمد ظفر بیگ نے جو مصنف مرحوم کے عم زاد برادر ہیں مرزا  
کے ذاتی اور خاندانی صحیح حالات ہم پہنچائے ہیں۔ حالات بطور مہیمہ آمدہ صفحات  
میں پڑھیں۔

خاکسار نظامی بدایونی

۴ مارچ ۱۹۳۵ء

# حالات مصنف

(از مرزا ظفر بیگ صاحب سہا پوری)

**خاندانی حالات** | آپ کے جدا جدا مرزا اختیار مرحوم جیشانی مقام تیمو علاقہ روسی ترکستان کے قدیم زمانہ سے تھے جیسی پشت میں آپ کا سلسلہ نسب مرزا فریدوں بختانی سے جو عرب امیر تیمور صاحب قرآن گورگانی کے زانو جلیس تھے ملتا ہے۔ مرزا اختیار مرحوم انھار میں سدھی کے آسمی میں اپنے چند خاندانی بنگروں سے پرست۔ سکر دہلی اشرف ابے اس زمانہ میں شاہ عالم بادشاہ کی حکومت قائم تھی۔ ملک میں سر طرف قرب۔ نر۔۔۔ مرہٹوں کے زور تھا اور حکومت بھی ہر ملک پران کے زیر اثر تھی۔ مرزا اختیار مرحوم شاہ عالم کے منور میں تین بھوکے شاہ عالم نے مرزا مرحوم کے خاندانی حالات کی بنا پر بہت قدر دانی فرمائی اور ان کو اپنی خدمت میں معمر خاص کے عہدہ برسر فرما دیا۔ لیکن مرزا چونکہ فن سپاہ گری میں کمال دستگاہ رکھے۔ تھے اس وجہ سے کچھ دنوں کے بعد مرزا مرحوم کو فوجی ننگ میں کسی معزز عہدہ پر تقرر کر دیا گیا۔ مرزا مرحوم نے اپنی سن لیاقت سے تھوڑے ہی عرصہ میں سپہ سالاری کا درجہ حاصل کر لیا۔ مرزا مرحوم کی اس ترقی کے باعث ایک مرتبہ فوجی افسر کو رشک پیدا ہو گیا اور دونوں کے باہم جیشمک ہو گئی۔

اتفاقاً ایک روز مرزا مرحوم اور مرہٹہ سردار میں کچھ لفظی تکرار ہو گئی جس کی وجہ سے مرزا مرحوم کو اس قدر طیش آیا کہ فوراً تلوار نکال کر مرہٹہ سردار کا کام تمام کر دیا۔ مرہٹہ سردار کے قتل ہونے سے تمام مرہٹی فوج میں بیجان پیدا ہو گیا اور وہ سب کے سب مرزا مرحوم کے قتل کے دریے ہو گئے۔ تندہ شدہ یہ معاملہ شاہ عالم بادشاہ کے روبرو پیش ہوا۔ مرہٹی فوج کے سرداروں نے مرزا کی شکایت کے دفتر کھول دیئے شاہ عالم بادشاہ نے مرہٹوں کے غصہ کو فرو کرنے کی غرض سے دفع الوقتی کے لئے مرزا مرحوم کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور اصل معاملہ کا فیصلہ کسی دوسرے وقت پر ملتوی فرمایا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ بادشاہ سلامت کی نیت یہ تھی کہ مرزا مرحوم کو کسی حیلہ سے ان کے وطن پہنچا دیا جائے۔ مگر مرزا مرحوم ایام نظر بندی میں تسبیح و تہلیل میں مشغول رہتے تھے اسی حالت میں تین ماہ کے بعد ایک روز علی الصبح نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دفعۃً گلیوں میں درویدہ آئے اور دو تین گھنٹہ کے بعد مرزا مرحوم نے شاہی قید ہی سے نہیں بلکہ قید حیات سے بھی نجات پائی **إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ**۔ مرزا مرحوم کی وفات پر ان کا تمام اثاثہ البیت ضبط کر لیا گیا۔ مرزا مرحوم کی اہلیہ محترمہ ابے دو صغیر سن بچوں کریم مرزا اور رحیم مرزا کو لیکر سہارنپور تشریف لے آئیں چونکہ مرزا مرحوم کی اہلیہ نہایت تعلیم یافتہ خاتون تھیں اس لئے اہالیان سہارنپور نے ان کی نہایت عزت کی اور انھوں نے ایک زمانہ مدرسہ قائم کیا جس میں علاوہ قرآن پاک کی تعلیم کے دیگر اخلاقی کتب ہائے فارسی کی بھی عمدہ تعلیم دی جاتی تھی یہ مدرسہ بہت عرصہ تک سہارنپور میں جاری رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد کریم مرزا اور رحیم مرزا بھی اپنی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو کر جوان ہوئے۔ کریم مرزا محکمہ پولیس میں اور رحیم مرزا تحصیل سہارنپور میں نائب ناظر

مقرر ہوئے۔ رحیم مرزا بیس سال کی عمر میں پانچ سال ملازمت کرنے کے بعد دفعۃً بعارضہ  
 بیضہ ۱۸۶۵ء میں لاوہ فوت ہوئے۔ گریم مرزا نے حکم پولیس میں خاطر خواہ ترقی کی  
 اور بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور فتحپور اور بلند شہر میں معزز عہدوں پر کام کیا۔ ۱۸۵۶ء  
 میں بلند شہر سے چھ ماہ کی رخصت لیکر تشریف لائے اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال  
 سہارنپور میں ہو گیا۔ آپ نے اپنی وفات کے بعد تین لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑی تھی  
 سب سے بڑے صاحبزادے مرزا محمد شفیع بیگ تھے جو عرصہ دراز تک ضلع سہارنپور کے  
 مختلف تعانوں میں کوتوال رہے ایام ملازمت میں تین جج کئے اور ۱۸۶۲ء میں ناظم دار  
 کے عہدہ سے پنشن پائی اور چھ سال تک پنشن پا کر ۱۸۶۷ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا  
 حکیم بیگ صاحب منجھلے صاحبزادے تھے آپ نے ۱۸۶۴ء میں امتحان مختار کاری پاس  
 کیا آپ کا کام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر رہا اور بہت بڑے کامیاب مختار کار ثابت ہوئے  
 حکام ضلع آپ کی خاص طور پر عزت کرتے تھے آپ کا انتقال ۱۸۹۱ء میں ہوا۔ آپ  
 نے اپنی وفات کے بعد کافی جائیداد زرعی و سکنی چھوڑی جو اب تک آپ کے بیٹوں کے  
 کے پاس موجود ہے۔ مرزا وزیر بیگ صاحب سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ آپ  
 ۱۸۶۱ء میں حکم پولیس میں ملازم ہوئے اور بہت تھوڑے عرصہ میں ترقی پا کر تھانہ دار  
 کے عہدہ پر پہنچے تھے۔ بہت عرصہ تک ضلع سہارنپور میں مختلف مقامات پر تھانہ دار  
 رہے۔ آپ نہایت قوی اور جسم تھے اب تک ضلع سہارنپور میں آپ کی طاقت کے کرسٹے  
 بیان کئے جاتے ہیں آپ نے ۱۹۰۳ء میں انتقال فرمایا۔

مرزا عزیز بیگ کی تاریخ پیدائش | مرزا عزیز بیگ صاحب مختص  
 بہ مرزا سہانپوری مرزا وزیر بیگ



صاحب مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ آپ ۱۸۶۵ء میں بمقام سہانپور پیدا ہوئے۔  
**تعلیم و تلمذ** | قرآن پاک وغیرہ کی تعلیم ختم ہوئے پر آپ منشی مولوی حبیب الدین صاحب مرحوم المتخلص بسوزاں کے زیر تلامذہ میں داخل ہوئے منشی صاحب فن شاعری میں حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے خاص شاگرد تھے۔ ایک مدت دراز تک غالب مرحوم کی خدمت میں دہلی رہے۔ اور غالب مرحوم کے انتقال پر سہانپور تشریف لائے جیسا کہ سوزاں صاحب مرحوم نے ایک نغزل کے مقطع میں فرمایا ہے ۔

غالب سے کام تھا سو وہ سوزاں گزر گئے

دہلی میں اب جناب کا کیا کام رہ گیا

مرزا عزیز بیگ صاحب کو اوائل عمری سے ہی شعر و سخن میں خاصی دل چسپی تھی اس پر قابل استاد کی توجہ ذہن کی رسائی تھوڑے ہی عرصہ میں فارسی اور اردو کی غزلیں تصنیف فرمانے لگے۔ منشی صاحب مرحوم اپنے ہونہار شاگرد کی تیری طبع دیکھ کر انکی تعلیم میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ چند ہی سال میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ آپ کو فارسی زبان میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی میں بھی خاصی بیاقت پیدا کر لی۔

**شاعری** | مرزا مرحوم ایک اعلیٰ ادیب اور شاعر تھے آپ ایک ایسے مخصوص رنگ کے مالک تھے جو اکثر ان کے ہمعصر شعراء کی ابتدائی روش سے قطعاً جداگانہ

حیثیت رکھتا ہے۔ آپ کی شاعری آپ کی استادانہ حیثیت کی تین دلیل ہے ضلع سہانپور اور دیگر اضلاع میں آپ کے بہت شاگرد موجود ہیں۔ آپ کا طریق اصلاح قابل تحسین تھا۔ اپنے ہر شاگرد کے کلام میں اس کے مذاق اور علم کے موافق ایسی اصلاح فرماتے تھے

کے جس کا جواب مشکل ہے۔ ۱۹۱۵ء میں چند احباب کے اصرار سے حضرت مرزا غالب مرحوم و مغفور کے دیوان کی تفہیم لکھنی شروع کی۔ ماہ اپریل ۱۹۲۲ء میں اس اہم کام کو سن و حودہ اتمام کو پہونچا یا اسی عرصہ میں آپ کو دردِ قریح کا دورہ پڑنے لگا اور اسی مرض میں چھ ماہ بعد ماہ اکتوبر ۱۹۲۲ء کے اخیر ہفتہ میں ۵۵ سال چھ ماہ کی عمر میں رحلت فرمائی۔ تاریخ وصال ۱۰ رورج مرزا بہشت میں پہونچی اناللہ وانا علیہ راجعون آپ نے اپنی وفات پر دولہ کیاں چھوڑیں۔

آپ نے ۱۸۸۵ء میں امتحانِ نمائندگی پاس کیا مگر شعرو سخن کا اسی درجہ

## ذریعہ معاش و طرز معاشرت

شوقِ نقاد کہ کچھری کے کاروبار کو ٹھص ضرورتاً انجام دیا کرتے تھے اور ہندو میں صرف ایک دو مرتبہ کچھری تشریف لے جاتے اور جو کچھ وہاں سے یافت ہوتی اس کو اپنے صرف میں لاتے۔ جب تک وہ رویہ صرف نہ ہو جاتا اس وقت تک کچھری تشریف نہ لے جاتے۔ آپ کی قانونی قابلیت بھی قابلِ تعریف تھی۔ اکثر طلباء آپ سے قانون بھی پڑھتے تھے۔

مرزا کی شادی ۱۸۵۲ء میں آپ کے عم اکبر مرزا عظیم بیگ صاحب مرحوم کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی علما و

## شادی

قرآنی تعلیم کے اردو اور فارسی میں کافی لیاقت رکھتی تھیں۔ امورِ فانداری اور حسنِ انتظام میں لائقِ تعریف تھیں اس وجہ سے شہر کے معزز رؤسا و غیوہ کی لڑکیاں بغرضِ حصولِ علم ان کے پاس آتیں۔ آپ کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا مرزا مرحوم اس حادثہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جلسہ شعرو سخن اور دیگر دنیوی مشاغل کو ترک کر دیا۔ ہر چند

اعزاء و اقربائے مرزا مرحوم کی توجہ عقد ثانی کی طرف دلائی مگر مرزا مرحوم نے ایک نہ سنی اور آخر دم تک اپنی اہلیہ مرحومہ کی یاد لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے اس زمانہ میں ایک نہایت یرد و غزل لکھی تھی جس کے مطلع سے دلی حزن و ملال کا اندازہ ہو سکتا ہے شعر

یاد ہیں وہ دن کہ ہم تھے اور زمانے کے مزے  
یاد آتے ہیں قفس میں آشیانے کے مزے

**مذہب** | مرزا مرحوم بہ اعتبار مذہب نہایت وسیع النہالی تھے۔ اعتقاد مذہب  
حنفی کے پیرو اور صوم و صلوة کے پابند نہ تھے۔ اگرچہ آپ کے پاس با  
اوقات مختلف مذاہب کے اشخاص کا جمع رہتا تھا مگر آج تک کبھی ایسا دیکھنے میں  
نہیں آیا کہ کسی صاحب کے مذہبی معاملات پر بحث یا گفتگو مرزا مرحوم نے کی ہو یا  
دوسرے مذاہب پر کبھی نقیضانہ زبان طعن کھولی ہو۔ ابتداءً مرزا کو اپنے اور شوقین  
طبع دوستوں کے اصرار پر محض رقص و سرود میں شریک ہونے سے احتراز نہ تھا مگر یہ سلسلہ  
۱۹۰۴ء میں بالکل ترک کر دیا تھا اور سلسلہ نقشبندیہ میں حضرت مولانا الحاج مولوی  
خلیل احمد صاحب جہا جہ کی مدرس اول مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور سے بیعت کی  
چنانچہ اس واقعہ کو مرزا مرحوم نے اپنی ایک نعتیہ غزل کے مقطع میں اس طرح پر واضح  
کیا ہے۔ شعر

بہت کچھ محبت زنداں میں کھویا وقت اے مرزا  
بس اب تو کچھ دنوں خدمت کرو اللہ والو نکئی

**اخلاق** | آپ کا اخلاق نہایت وسیع تھا ہر خاص و عام سے نہایت خندہ

پیشانی اور تواضع سے پیش آتے تھے۔ آپ کی نشست گاہ میں احباب اور تلامذہ کا جلسہ رہتا تھا مگر ان کے جلسے میں کبھی کسی کی یہ مجال نہ ہونی تھی کہ کسی کی غیبت یا بدگوئی کرے۔ آپ نہایت کم سخن اور متین تھے بلا ضرورت کسی سے زیادہ شگلو نہیں کرتے تھے۔

## فہرست غزلیات تضمین شدہ

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۱	الف	نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا	۱
۲	"	دل مرا سوزِ نہاں سے بے کا باطل گیا	۲
۳	"	شوق ہر رنگ رقیب سرو سامان نکلا	۳
۴	"	دھمکی میں مر گیا جو نہ باپ بردخا	۴
۵	"	دہر میں نقش وفا و جدائی نہ ہوا	۵
۶	"	مستکش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	۶
۷	"	حرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۷
۸	"	جرم شاہنشاہ میں اسعار کا دفتر کھلا	۸
۹	"	شب کہ برق سوزِ دل سے زہرہ ابر آں تھا	۹
۱۰	"	نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا	۱۰
۱۱	"	بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا	۱۱
۱۲	"	دوست غمخواری میں میری سستی فراموش گئی کیا	۱۲
۱۳	"	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا	۱۳
۱۴	"	ہوس کو ہے نشاط کا کیا کیا	۱۴

نمبر غزل	روایف	مصرع اولے ہر غزل	صفحہ
۱۵	الف	در خورِ قبر و غصیب جب کوئی ہم سادہ ہوا	۲۳
۱۶	"	پئے نذرِ کرم تحفہ سے شرمِ نارسانی کا	۲۶
۱۷	"	گردِ اندوہ شبِ فرقت بیان ہو جائے گا	۲۷
۱۸	"	دردِ منت کش دوانہ ہوا	۲۹
۱۹	"	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا	۳۱
۲۰	"	جب بتقریب سفر یار نے محلِ باندہا	۳۲
۲۱	"	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۳
۲۲	"	وہ مری ہیں جنہیں سے غم نہ ہاں سمجھا	۳۴
۲۳	"	پھر مجھے دیدہ تر یا د آیا	۳۶
۲۴	"	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۳۸
۲۵	"	تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا	۴۰
۲۶	"	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	۴۲
۲۷	"	ذکر اس پر یوش کا اور پھر بیاں اپنا	۴۳
۲۸	"	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۵
۲۹	"	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۷
۳۰	"	کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۴۹
۳۱	ب	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۵۰
۳۲	ت	آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۵۲
۳۳	۰	غیر یوں کرتا ہے پرش مجھ سے ان کے بھر میں	۵۴
۳۴	د	حسنِ غمرے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد	۵۶
۳۵	ر	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار	۵۸

صفحہ	مصرع اوّلے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۶۰	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	ر	۳۵
۶۲	کیوں مل گیا نہ تاب رنج یار دیکھو گھر	"	۳۶
۶۳	لوڑنا ہے مراد دل ز محبت جہر و رنشاں پر	"	۳۷
۶۶	ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور	"	۳۸
۶۹	مازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور	"	۳۹
۷۱	تحریف مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز	ز	۴۰
۷۲	کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز	.	۴۱
۷۳	نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز	.	۴۲
۷۵	زخم پر چیر چیں کہاں طفلان بے پروا، ملک	ک	۴۳
۷۶	آد کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک	"	۴۴
۷۸	ہے کس قدر بلا کہ فربہ وفا کے گل	ا	۴۵
۸۰	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	ر	۴۶
۸۲	ممکن نہیں کہ بھول کے کبھی آرمیرہ ہوں	.	۴۷
۸۴	کی وفا ہم نے تو نیر اس کو جفا کہتے ہیں	.	۴۸
۸۶	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	.	۴۹
۹۸	ہم سے کھل جاؤ بوقت سے پرستی ایک دن	"	۵۰
۸۹	ہم پر جفا سے ترک وفا کا گناں نہیں	"	۵۱
۹۰	ہر چند جاں گدازئی قہر و ستاب ہے	"	قطعہ
۹۱	مانع دشت نور دی کوئی تیرا میر نہیں	"	۵۲
۹۳	جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں	.	۵۳
۹۷	ملتی ہے خوشی یار سے نار انتہا تب میں	"	۵۴

نمبر غزل	ردیف	مصرع اول ہر غزل	صفحہ
۵۵	ن	کل کے لئے کرا آج نہ خست شراب میں	۹۷
۵۶	.	حیرا ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں مگر کو میں	۹۹
۵۷	"	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	۱۰۲
۵۸	"	مالہ بڑ حسن طلب اسے ستم ایجاد نہیں	۱۰۳
۵۹	.	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتبار نہیں	۱۰۵
۶۰	.	تیرے توسن کو صابا بندھتے ہیں	۱۰۶
۶۱	.	دام پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	۱۰۸
۶۲	"	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۱۰
۶۳	"	دیوانگی سے دوش یزمار بھی نہیں	۱۱۳
۶۴	.	نہیں ہے رزم کوئی بحیرہ کے درخور مرے تن میں	۱۱۶
۶۵	"	مرے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۱۷
۶۶	.	دل ہی توبہ نہ سنگ و ست درو سے بد نہ آئے کیوں	۱۱۸
۶۷	.	غنیہ، ماسکفہ کو دور سے مت دیکھا کہ لیں	۱۲۰
۶۸	و	وارستا اس سے چہا کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۲۲
۶۹	.	قفص میں ہوں گر اچھا بھی۔ جانیں میرے شیون کو	۱۲۳
۷۰	.	دی سادگی سے جان پڑوں کوہ کن کے پانوں	۱۲۶
۷۱	.	واں پہونچکر جو غش آتا ہے ہم ہے ہم کہ	۱۲۷
۷۲	"	نم جانو تم کو غیر سے جو رزم و راہ ہو	۱۲۹
۷۳	"	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو	۱۳۱
۷۴	"	کسی کو نے کے دل کوئی نوا سنچ فغاں کیوں ہو	۱۳۳
۷۵	ی	مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے	۱۳۶

نمبر غزل	ردیف	مصرع اوّل ہر غزل	صفحہ
۷۶	ی	بساطِ بحر میں محاکم ایک دل ایک قطرہ غم وہ بھی	۱۳۸
۷۷		غم دیا سے گر پانی بھی فرصت مراٹھانے کی	۱۳۹
۷۸	.	کیا تنگ ہم تم زدگیاں کا جہان ہے	۱۴۱
۷۹	.	درد سے تم کو ہے میرے بے قراری ہائے ہائے	۱۴۲
۸۰	"	سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے	۱۴۳
۸۱	"	گر فاستی سے فائدہ اخلائے حال ہے	۱۴۴
۸۲	"	عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی	۱۴۷
۸۳	.	اس جرم میں مجھے نہیں بنتی حیا کے	۱۴۹
۸۴	"	رفتارِ عمر قطع رہ اضطراب ہے	۱۵۱
۸۵	"	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر رشک آجائے ہے	۱۵۲
۸۶	"	سادگی پر اس کی مر جائے کی حسرت دل میں ہے	۱۵۵
۸۷	.	دل سے تری نگاہِ طرنگ اتر گئی	۱۵۶
۸۸	.	تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ہے	۱۵۸
۸۹	"	کوئی دن گر زندہ کافی اور ہے	۱۵۹
۹۰	"	کوئی امید پر نہیں آتی	۱۶۱
۹۱	"	دلِ ناداں مجھے ہوا کیا ہے	۱۶۳
۹۲	.	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ فالیرِ موئے	۱۶۵
۹۳	.	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۱۶۷
۹۴	"	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۶۹
۹۵	"	ظلمتِ کردہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۲
۹۶	"	نہ ہوئی گر مرے مرے سے تسلی نہ سہی	۱۷۳



نمبر غزل	روایف	مصرع او لے ہر غزل	صفحہ
۹۷	ی	عجب نسا ط سے ملا دے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۶
۹۸	.	نگوہ کے نام سے بے مہر خا ہوتا ہے	۱۷۷
۹۹	"	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۷۹
۱۰۰	"	اگر وہی جان کو قرار نہیں ہے	۱۸۲
۱۰۱	"	ہجومِ غم سے یاں تک نہ نگرانی مجھ کو حاصل ہے	۱۸۳
۱۰۲	.	حسن بزم سے تو ناز سے گفتا رہیں آوے	۱۸۴
۱۰۳	"	حسن درگرہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے	۱۸۶
۱۰۴	"	غیر میں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۸
۱۰۵	"	پھر اس انداز سے بہا سائی	۱۹
۱۰۶	.	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	۱۹۳
۱۰۷	"	جس زخم کی ہو سکتی ہو نہ دیر رفوی	۱۹۴
۱۰۸	"	یہاں آجیوں کو جتنا چاہیے	۱۹۶
۱۰۹	"	ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱۹۸
۱۱۰	"	نکندہ ہیں ہے غم دل اس کو سنا ہے نہ بے	۲۰۰
۱۱۱	"	وہ آکے خواب میں شکنیں اضطراب تو دے	۲۰۲
۱۱۲	"	تپش سے میری وقف کش کش ہر تار بستر ہے	۲۰۳
۱۱۳	.	خطر ہے رشتہ الفت رگ گردن نہ ہو جائے	۲۰۳
۱۱۴	"	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	۲۰۳
۱۱۵	"	ہم رشک کو اسے بھی گوارا نہیں کرتے	۲۰۵
۱۱۶	"	دیا ہے دل اگر اس کو شربے کیا کہیے	۲۰۵
۱۱۷	"	دیکھ کر درپردہ گرم دامن افشانی مجھے	

صفحہ	مصرع اوئے ہر غزل	ردیف	نمبر غزل
۲۰۹	یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے	ی	۱۱۸
۲۱	حضور شاہنشاہ اہل سخن کی انعامی ہے	"	۱۱۹
۲۱۲	کبھی ٹپکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے	"	۱۲۰
۲۱۳	باز بچہ اطفال ہے دنیا میں آگے	"	۱۲۱
۲۱۶	کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیے	"	۱۲۲
۲۱۸	روئے سے اور عشق میں بے باک ہوئے	"	۱۲۳
۲۲۰	ابن مریم ہوا کرے کوئی	"	۱۲۴
۲۲۲	بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے	"	۱۲۵
۲۲۳	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نہ لے	"	۱۲۶
۲۲۵	مستی بذوق خلعت ساقی ہلاک ہے	"	۱۲۷
۲۲۵	حس جانیسم شانہ کش زلف بار ہے	"	۱۲۸
۲۲۷	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	"	۱۲۹
۲۲۹	چپ تنگ وہاں زخم نہ پیدا کرتے کوئی	"	۱۳۰
۲۳۱	بہنم بہن لارہ لمان زاد ہے	"	۱۳۱
۲۳۳	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	"	۱۳۲
۲۳۵	غم کھاتے میں بودا دل ناکام بہت ہے	"	۱۳۳
۲۳۷	مدت ہوئی ہے یار کو کہاں کئے ہوئے	"	۱۳۴
۲۴۰	نویز امن ہے پیر و دوست جاں کے لئے	"	۱۳۵
۲۴۳	میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی	"	۱۳۶
۲۴۵	آپ نے مستی الہی کہا ہے تو سہی	"	۱۳۷
۲۴۶	کی شرح نظم غالب تعین میں جو مرزا	"	قطبہ تاریخ
۲۴۷	تعمین برکلام مولانا جامی، میر تقی میر اور حبیب الدین سوزاں	"	ضمیمہ



کیا یہ منشا فضا از لہ میں کاتب تقدیر کا  
 ذرہ ذرہ ہو فنا اک روز پس تعمیر کا  
 رنگ جھلکایے کیوں ہر چینیں تعمیر کا  
 نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا  
 کاغذی ہے پیرزن ہر پیکر تصویر کا

درد و غم کرتے ہیں جو کچھ روح فرسائی پوچھ  
 حسرتیں کرتی ہیں جو ہنگامہ لڑائی پوچھ  
 توڑتی ہے دل کو کیونکر ناشکیبائی پوچھ  
 کاؤ کا وسخت جانی ہائے تنہائی پوچھ  
 صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آرزوئے قتل کو لب پر نہ لانا چاہیے  
 ہاں مگر درد پر درد تدبیر و تقاضا چاہیے  
 کھینچ کہ خود آئے اشراق قل پر اتنا چاہیے  
 جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے  
 سینہ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

کوئی کم مایہ اگر برسوں طبیعت کٹائے  
 غیر ممکن ہے کوئی نکتہ مے نکلتوں سے پائے

۱۵ بعض ستارہ میں نے اسی شعر کو جب مسمیٰ قرار دیا ہے حالانکہ ایسا کہنا سراسر بے المعانی ہے ہر زاغہ آب سے  
 عبدالمہزاق شاکر کو اس شعر کی تشریح یوں لکھ کر بھیجی ہے : کہ "ایران میں رکھ ہے کہ دادخواہ کاغذ  
 کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلایا یا خون آلودہ کپڑا لباس پر لٹکا کر  
 لے جاتا ہے۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے  
 اور اس کا پیرزن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہے موجب رنج و ملال  
 و آزار ہے"

لاکھ ساع کاں اپنے پیری باتوں جاکے      آگہی دامِ تنہیدن جس قدر چاہے بچائے  
 مدعا عتقا ہے اپنے عالمِ تفسیر کا  
 جوشِ وحشت جب مجھے تھمے نہیں تیا ذرا      پھر ہے مزا سلسلہ بیکار قید و بند کا  
 ہیں کسے نزدیک طوق و رَسَن تو چیز کیا      بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتشِ ریزا  
 موتے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

کیا بتاؤں آتش الفت میں کیا کیا جل گیا      ساز و سامانِ ہستی کا سراپا جل گیا  
 جسم بالکل بچک گیا ہے اور کلہا جل گیا      دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا  
 آتش خاموش کی مانند گویا جل گیا  
 مجھ کو دعویٰ ہے ہلا دیتی ترا دل ہر صدا      لیکن اب بے اثر ہے میں گجا اور تو گجا  
 نادر ہو سکتا ہے اپنی حدِ امکان تک سا      میں عدم سے بھی پرے ہوں نہ غافل باہا  
 میری آہِ آتشیں سے بالِ عتقا جل گیا  
 خیمہ جو آتشِ غم دل میں جھٹکتا ہے نہاں      ورنہ پھر چھوڑ گئی کیا دنیا میں یہ برق تپاں  
 ذکر سے اس کے زبانِ شمع ہوتی ہے زباں      عرض کیجئے جو ہر اندیشہ کی گرمی کہاں  
 کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرَا جل گیا  
 دیکھنے کو اب بھی ہے سرد چراغاںِ جسم زار      دل کی ہستی پر ہے لیکن داغ کا دار و مدار

اب تو اک ظلمت کدرہ سینہ ہے گوہرِ دلفا  
دل نہیں تجھ کو دکھاتا اور نہ غفل کی ہمار  
اس چہراغاں کا کروں کیا کار فرما بل گیا  
ہے فراق ہمنشیناں پر طبیعت مشتعل  
کمر دیا سوز و گداز دل نے مژدہ مضمحل  
کوئی دل بھی تو نظر آتا نہیں غمشِ غل  
میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبِ دل  
دیکھ کر طرزِ تپاکِ دل دنیا جل گیا

پنجرہ دیو جنوں دشمنِ داماں نکلا  
اس سے بکھر نہ کوئی تارِ گریباں نکلا  
ننگِ طبعوسِ تین عاشقِ حیراں نکلا  
شوقِ ہرزنگِ رقیبِ ہر و ساماں نکلا  
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا  
دل میں ٹھہری نہ سنال کوئی گھڑی بھی یاز  
کس ہلاکی اسے حاصل ہے روانی یاز  
حسرتِ بوسہ سو فار نہ نکلی یارب  
زخمِ نہ داؤد دی تنگی دل کی یارب  
تیر بھی سینہ بسمل سے پراشتاں نکلا

۱۔ اس شعر کا مطلب مزا غالب نے خود ہی جلدِ رزاق شاکر کے خط میں اس طرح لکھا ہے "رقیب یعنی مخالف شوق  
مُراسماں کا دشمن ہے دلیل یہ ہے کہ قیس جو زندگی میں بکھر پڑا پھر تاتھا تصویر کے پردے میں بھی بنگاہی رہا  
یہ ہے کہ محسنوں کی تصویر باطن عریاں کی گھنٹی ہے جہاں گھنٹی ہے ۲۔ اس شعر کے متعلق مزا صاحب نے  
شاکر کو لکھا ہے یہ ایک بات میں نے اپنی طبیعت نکالی ہے جیسا کہ اس شعر میں ہے کہ نہیں مذکور راحت  
حراحت پیکان ۳۔ وہ زخم تیغ ہے جسکو دکھایا ہے۔ یعنی زخمِ تیر کی توہین بسبب ایک خندہ ہو چکا ہے اور تو اس کے زخم  
کی تھیں بسبب ایک طاقِ ساسل جانے کے زخمِ نہ داؤد دی تنگی دل کی۔ یعنی زائل نہ کیا تنگی کو پراشتاں۔ یعنی چلتا  
اور لفظ تیر کے مناسب ل ہے مگر تنگی دل کی داد کیا دیتا وہ تو خود تین مقام ہے مگر اگر پراشتاں اور تیر

کون ہے جسکو ہے جمیبت خاطرِ حاصل      کوئی آشفۃ کوئی منشور میں داخل  
گھر ہے یا ہے کوئی شوریدہ سروں کی منزل      ہوئے گلِ تلاؤں دو در چرخِ محفل  
جو تری بزم سے نکلا سو پیشیاں نکلا

خوب لڑے میں نے دلیں جو تھی نعمت درد      کسکی تقدیر کو یوں ہاتھ لگے دولت درد  
کیوں ہوتی مجھے ہر دم طلب کثرت درد      دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذت درد  
کام یاروں کا بقدر لب و دندان نکلا

مدتوں دل کو رہی لذت آزار پسند      تھک کر جاں کو دمِ خنجرِ خونخوار پسند  
اب بقا پائی نہیں ہے میں نہا پسند      ہے نوا موزِ فنا ہمت دشوار پسند  
سخت مشکل ہے کر یہ کام بھی آسان نکلا

قطرۂ اشک جو آنکھوں سے بہا یا غالب      رشکِ دریائے شر کا لہجہ بنایا غالب  
تارِ مژاں پہ چھو شکوں کا لگا یا غالب      دلیں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب  
آہ جو قطرہ ز نکلا تھا سو طوفان نکلا

کہتا ہے کون عشق میں فرادِ فرد تھا      ہاں تھا جو کچھ تو قیسِ بیابانِ نورد تھا  
وہ کیا جو کچھ ضعیفہ کے حملے میں سرد تھا      دھکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا  
لے نہ ادا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلتے ہیں کہ سنئے عرفِ عشق کی دھکی میں باکرہ کی طرح جان نہیں دی سکریم  
تو مردانگی کیسا ہے عشق اور مصائبِ عشق کا مقابلہ تمام عمر کرتے رہے۔

عشق نبرد پیشہ طلب گار مرد تھا

کچھ وقفہ حیات جو مجھ کو عطا ہوا      تھا اس میں بھی فنا کا تصور بندھا ہوا  
گویا وطن میں تنہا درِ غربت کھلا ہوا      تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مارنگ زرد تھا

تحصیلِ درس صرف فکر چکا تھا میں      الفت کے امتحان سے فالغ ہوا تھا میں  
بلے ہری زمانہ سے نا آشنا تھا میں      تالیفِ نسخہائے وفا کر رہا تھا میں

مجموعہ خیال ابھی فرد فرد تھا

سیدہ کہ ایک تخرمہ مشق جنوں ہواب      جو داغ ہے کز خم ہے وہ لالہ گوں ہواب  
حالت ہر ایک عضو کی زار و زبوں ہواب      دل تاجگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہواب

اس رہ گزریں جلوہ گل آگے گرد تھا

ہاروں نے دل لگانے کو سمجھا ہے دل لگی      حالانکہ آفتیں ہیں ہمیشہ نئی نئی  
ممکن نہیں نجات ملے غم سے جیتنے جی      جاتی ہے کوئی کش مکش اندوہِ عشق کی

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

حاصلِ غرض ہوئی نہ مرے قید و بند سے      تھا مدعا کہ گھر میں یہ وحشی پڑا رہے  
چھوڑی نہ اپنی خود آوارہ گرد نے      احباب چارہ جوئی و حشت نہ کر سکے

زندوں میں بھی خیالِ بیا بیاں نورِ دغا

مژدہ یہ رسم ظلم و ستم کیا یہاں کی ہے      مٹی خراب بیلِ ہندوستان کی ہے  
شاکِ جو اس زمانہ ناقدِ رواں کی ہے      یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے

حقِ مغفرت کے عجب آزاد مرد تھا

لے ماشیہ اگلے منور پر

دعہ پورا کبھی اس شوخ کا کوئی نہ ہوا قصہ کوتاہ وفا عہد وفا بھی نہ ہوا  
فیض کچھ ہستی مویوم سے اس کی نہ ہوا دہریں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا  
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

سب غلط ہے کہ زبرد و ہی ہو گا اعلیٰ جس کا نظارہ کرے مارسیہ کو اندھا  
کس طرح کہتے کہ پتھر میں اثر یہ ہو گا بنزہ خط سے ترا کا کلی سرکش نہ دبا  
نہ زمر و بھی حریف دم افعی نہ ہوا

اس سے مایوس ہوا ہوں کہ جہاں چھوٹوں جیتے جی دام غم ہو تر با سے چھوٹوں  
غیر ممکن ہے کہ میں رنج و بلا سے چھوٹوں میں نے چاہا تھا کہ اندوہ وفا سے چھوٹوں  
وہ ستم گر مرے مرنے پر بھی راضی نہ ہوا

ما شہد است کہ جہاں کو حد بختے عجیب آزاد و عقلاش کیلئے بھی پابند کف ہو گا اور اپنی آزادی  
مرکز کی برقرار رکھی حضرت ذوق نے اپنی موت کے متعلق اسی قسم کا شعر کہا ہے

کہتے ہیں آج ذوق جلاں سے گر گئی کیا کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

لے غالب صاحب سانپ اور زمر کے متعلق چودھری عبدالغفور کو اس طرح لکھا ہے "قبول دعا وقت طلوع غم  
مضامین شہری ہے جیسے کتابوں کا پرتو ماہ میں پھٹ جاتا اور زمر سے افعی کا اندھا ہو جانا"

دام افعی۔ سانپ کی جھٹکار۔ زمر و بنزنگ کا قیمتی پتھر جسکے دیکھنے سے سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔

آصف الدولہ ولی اودھ نے اس کا قہر کیا۔ سانپ کے سامنے زمر رکھا۔ لیکن سانپ اندھا نہ ہوا۔ غالب صاحب  
نہ انکی تائید میں بنزہ خط کو زمر اور زلف کو سانپ سے تشبیہ دے کر معیون پیرا کیا ہے۔



ہم جو اس دم میں کمزور ہیں تو کمزور ہی ہیں      کم ہیں نہ ہاں سے زندوں کے برابر ہی ہیں  
آئینہ اپنا مکدر ہے مکدر ہی ہے      دل گزر گاہ خیال نے وسا غری ہی  
مگر نفس جاوہ سیر منزل تقویٰ نہ ہوا

ہو رہے تھے ترے لانے میں جو معترف ابھی      مجھ کو ممنون بنائے کو تھے احباب سبھی  
کھل گئی ان کی غرض تو نے بھی ٹالے نہیں      ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی  
گویش منت کش غلبا نگ تسلی نہ ہوا

کس سے دل کھول کے کچھ شکوہ کلفت کیجئے      کون ہے کس سے بیانِ غم و حسرت کیجئے  
کس دعا کے لئے امید اجابت کیجئے      کس سے غرومی قسمت کی شکایت کیجئے  
اُم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ذکر کرتا تھا مسیحا کا جو سب سے غالب      تنگ مرزا تھا غم و رنج و تعب سے غالب  
منتظر مرگ کا تھا دیکھئے کب سے غالب      مر گیا صدرِ مریدِ جنبشِ لب سے غالب  
نا توانی سے حریف دم عیسیٰ نہ ہوا

نہ کچھ مرغوب نہ کھو نہ کوہِ نظارہ گلستاں کا      نہ سوا اسی پر حسن و جمال جو رولماں کا

۱۔ دم عیسیٰ عیسیٰ کی پھونک حضرت عیسیٰ ایک بزدست پیغمبر گزشتے ہیں اگلے ماننے والوں کو یہ سانی کہتے ہیں مسلمان  
بھی انکو یہ مانتے ہیں انکا یہ جرحہ تھا کہ اپنی پھونک سے مر وہ زندہ کر دیا کرتے تھے۔ فرماتے ہیں یہ سیکانہ مجھے حیات  
دینے کیلئے لب ہلائے مگر میری ناتوانی کو جنبشِ لب بھی گمراہ کن کر دی اور یہ صدمہ میری بڑانت نہ کر سکا۔ (باقی مشہر)

ہمارا دل ہے وارفتہ بہارِ بزمِ جانان کا      ستائش کرے زاہدِ مستعدِ حسنِ خانِ ضیواں کا

وہ اک گلِ رستہ ہے ہم بخود کے طاقِ نسیاں کا

لیا کرتا ہے کام ابرِ حق سے ظالمِ بیخِ بڑاں کا      شمار آساں نہیں خود و جاناں چمِ قضاں کا

مگر اس پر بھی دل تسبیحِ خواں ہے نامِ جانان کا      بیاں کیا کیئے بیدار کاوشِ ہائے شرکاں کا

کہ ہرک قطرہِ خوں دان ہے تسبیحِ مرجاں کا

بہت کچھ سخی و کوشش کی کہ کو کوئی لے نالو کو      لبوں تک بھی نہ آنے دیوں کبھی سینے سے نالوں کو

مردودی صورت نے نہیں دندان نے نالوں کو      نہائی سوطِ قاتل بھی مانعِ مے نالوں کو

یہاں دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہِ میتاں کا

خدا نا خواستہ داغِ جگر اپنا جو جل اٹھے      زبانِ شمع پیدا ہوا بھی ہر اک مہنِ موسے

بھی دیکھے کہاں ہیں تم سے شعلے سوزِ باطن کے      دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرغتِ زمانے نے

طاہر داغِ دل اک تخم ہے مگر پھر اغاں کا

نظر آنے لگے چاروں طرف اکھوں میں تجھ سے      درو دیو اتیرے عکسِ رخ سے جگمگا اٹھے

ہوئے آثارِ ظاہر یک حدت میں کثرت کے      کیا آئینہِ خاندان کا وہ نقشہ تیرے جلوئے

کے جو پر تو غورِ شیعہ عالمِ شہنشاہ کا

بظاہر کتنی حکمِ خاندان کی بسا رکھی      مگر خود سخیِ صانع و جہاں سب فنا نکلی

بنے گی صاعقہ اک دن یہی صانع کی دل گری      مری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورتِ خرابی کی

گزشتہ سے پیوستہ جو جنبشِ لبِ زندگِ بخشے والی تھی میرے لئے موت کا باعث بن گئی۔

ہیولے برقِ خرمن کا ہے خونِ گرگدِ تفتاک  
 دمِ ہیجانِ وحشت پاؤں میں ہوتا ہے اک کلر  
 مری اہولے بن بکر گولے اٹھتے ہیں طن بھر  
 یہ نوبتِ صحن کی پہنچی کہ تشنگِ زن ہے محراب  
 اکا ہے گھومیں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر  
 مارا ب کھوٹے پر گھاس کبے میے دریا کا

میرے جل جھینے کی دنیا کو ناسحقِ جستجوئیں ہیں  
 جگر کی آگ کا اظہار کم ظفوں کی خوئیں ہیں  
 نہ شکوے میں نہ ب پر سوزِ دل کی گفتگوئیں ہیں  
 خوشی میں نہال خود گشتہ لاکھوں از روی ہیں

چرخِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ عیاں کا  
 تصور میں جو وہ تصویرِ پرانوار باقی ہے  
 یہ اک شکلِ تسلی بخش جانِ زار باقی ہے  
 ہونے ہم خاک اس کی گرمی بازار باقی ہے  
 دلِ افسردہ گو یا جزہ ہے یوسف کے زنداں کا

مری قسمتِ بری ہے آپ ہوتے ہمیشیں رنہ  
 پسندایا ہے کرتے کیوں مجھے اندوگئیں رنہ  
 یہ وری دیدہ و دانستہ ہے بہتے قری ورنہ  
 بغل میں غیر کی آج آپ سوئے ہیں کہیں رنہ

سبب کیا خواب میں اگر تم مٹے پناہاں کا  
 سبب تیری خوشی کا میں نے مٹانے کو کھاتھا  
 تراغم دیکھ کر عجب کو قلع ہے اپنے مرنے کا  
 یہ میری تعزیت اور سب مل ملکر تزارونا  
 نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا  
 قیامت ہے سرخ آلودہ ہونا تیرے شرکاں کا

کھلا ہے سامنے منظرِ عدم آباد کا غالب  
 سمجھتا ہے اسے مرزا سفر کا مٹنا غالب

اسی میں منتشر ہوتے ہیں اور اوراقِ غالب  
نظر میں ہے ہماری جاوہ راہِ فنا غالب  
کر یہ شیرازہ ہے عالم کے اجڑا پریشاں کا



کیوں ہو رہا ہے خیمتہ بربط نواز کا      گرویدہ کس لئے ہے عراق و حجاز کا  
ہے ہرزباں پر راگ اسی بے نیاز کا      محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا  
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

خنداں جو میرے حال پر وہ ماہ پار ہے      جاگے نصیب اونچ پر اپنا ستار ہے  
پڑ مرگیا پیری خوشی کا اشارہ ہے      رنگ شکستہ صبح بہار نظر ارہ ہے  
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

ملتا بھی ہے جو مجھ سے تو مادہ ستیز      دشمن کے ساتھ رام ہے مجھ سے رگ و گریز  
مجھ سے تنفر اور رقیبوں سے خیر و میز      تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز  
میں اور دکھ تری مژدہ ہائے دراز کا

بیتاب ہوں گا صورت برق و شمر نہیں      نلک کروں گا درد سے شام و سحر نہیں  
خاموش ہوں جتاؤں گا دردِ گلشن میں      حرف ہے قبط آہ میں میرا و گرنہ میں  
کلمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

سب کے ہیں انکی بزمِ میل و مل نکل ہے      آبِ بقا کے چشمہ ہیں گویا ابل رہے

مستوں میں پہ پہے ہیں عجب دور چل ہے      ہی بسکرو خوش بادہ سے خیشے اچل ہے  
ہر گوشہ بساط ہے سرخیشہ باز کا

اُس کو ہے رات دن طلب تیر سینہ دوز      مطلوب اس کو شام و سحر سوز سینہ سوز  
اس بواہوس کو چاہیے اک زخم تازہ روز      کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہنوز

ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

مرزا کے دل کی پوچھتے ہو بات کیا اسد      صدقے میں عشق کے بیجر گھر اسد  
بر باد مفت گنج ہوا ہر گستا اسد      تاراج کاوش غم بھرا ہوا اسد

سینہ کہ تھا دھینہ گھر ہائے راز کا



ہو نوید اہل سخن کو خیر کا منظر کھلا      باب بیدل وجود گو یا کتہ سخنوں پر کھلا  
اس جہان سے گرداد و دہش کا در کھلا      بزم شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا

رکھو یا رب یہ در گنجینہ گو ہر کھلا

زینت بزم فلک کا حال جب مجھ پر کھلا      تب مسرت سے ذرا اپنا دل مضطر کھلا  
شاہِ خاد چھپ گیا رونے میں انور کھلا      شب ہوئی پھر انجم زرخندہ کا منظر کھلا

۱۔ ان مشاعروں کا طرف اشارہ ہے جو حضرت بہادر شاہ ظفر کے زیر پرستی قلعہ علی میں ہوا کرتے تھے اور  
جن میں مرزا صاحب بھی شرکت کیا کرتے تھے ۲۔ دوسرے شعر میں شاہو کی چہل پہل اور رونق کو بتکرار کے  
حسن و جمال سے تشبیہ دے کر ایک لطیف بات پیدا کر دی ہے۔

اس تکلف سے کہ گویا بت کردہ کا در کھلا

چاہیے مدت اگر یاروں کے گناؤں فریب      انکی ہر اک بات میں چاہوں تو دکھلاؤں فریب  
اعتبار انکے مجھے کیونکر ہو جب پاؤں فریب      گرم ہوں یوں پر کیوں دست کا کھاؤں فریب

آئیں میں دشنہ نہ پاں ہاتھ میں نشتر کھلا

بزمِ زمیں سے اس بڑاؤ کی کب تھی امید      نشہ میں آئندہ ملنے کی بھی دیتا ہے نوید  
اس خوشی میں ہے دل وارفتہ نگرم نشید      گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید

پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پہکے کھلا

عمر بھر دل میں رہا شاہد پرستی کا خیال      اب حقیقت کھل گئی اسکی کہ تھا اچھا خیال  
اس بہشتی رو کا آخر آج کام آیا خیال      بے خیال حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال

خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

واہ کیا ہنسنے کا زینت دہے حسن و نشیں      حسن کے پر تو سے ہو جاتا ہے زیور بھی حسین  
نور سے اس لئے تباہاں ہے ہر شے خوشہ چین      منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں

زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

گھر کی ظلمت دیکھ کر یہ فائدہ کپوں ہوں ملوں      جو بلا نازل ہو سر پر بچکوبے دل سے قبول  
کیونکہ شبِ تیرہ کا شکوہ لب تک آنے دوں قبول      کیوں نہ چھری و شبِ غم ہے بلاؤں نزول

آج ادھر ہی کو بے گادیہ اختر کھلا

جب کیا قصد سفر تو تھا طبیعت میں خیال      اپنے بیکانوں کی الفت چھنے دل سے نکال  
کر دیا ترک وطن ترکِ تعلق ہے محال      کیا رہوں بت میں خوشی جب خود ادا نکال

نام لانا ہے وطن سے نام پر اکثر کھلا

میں نے دل پر نقش کر لی حضرت مژا کی پند  
 آستانِ غیر پر کیوں جاؤں ہو کر مستمند  
 چاہلوں سی اہل و دنیا کی نہیں مجھ کو پسند  
 اسکی امت میں ہوں میں میسے رہیں کیوں کار بند  
 واسطے جس شہ کے غالب گنبد بے در کھلا

۹

اسکی آمد کے تصور میں جو میں بے تاب تھا  
 اشکباری سے رواں اک سیلِ خونِ ناب تھا  
 نیند کا آنکھوں میں ناک خیال خواب تھا  
 شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرِ ابراب تھا  
 شعلہ جو آہ ہر اک حلقہ گر داب تھا  
 کنجِ تنہائی میں میں تھا اور وہاں دربارِ ما  
 وہ عدسے کے ساتھ ہنسنے تھے محضے سے کما  
 میں بہا تا تھا یہاں نسو وہاں تھا دورِ جا  
 وال کرم کو غدر بارش تھا افعالِ گیرِ خرام  
 گر یہ سے یاں پینہ بالمش کفِ سیلاب تھا  
 میں یہاں سنبل کی صورتِ غم سے تھا آشفہِ جا  
 اور وہاں راستہ ہونے سے زلفونکے جال  
 تھی یہاں حیرت ہاں تھی آئینہ کی دیکھ بھال  
 و ان خود آرائی کو تھا موتی پرٹنے کا خیال  
 یاں ہجومِ اشک سے نارنگہ نایاب تھا

لے مفتح میں قلابِ ماسد شبِ معراج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میں بھی امت میں ہوں جن کے لئے عرش  
 پہر جاتے وقت آسمان کے دروازے کھل گئے تھے پہو میرے کام کس طرح بندھ سکتے ہیں وہ بھی کھل جائیں گے۔  
 معراج اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک رات حضرت محمد کو دیکھا انبیاء سے ان کا درجہ بلند کرنے  
 کے لئے عرش پر بلا یا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک خاص سواری (براق) پر سوار ہو کر آسمانوں کا فاصلہ طے کر کے  
 اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچے تھے۔

وہ وہاں کرتے تھے ہاتھوں سے حالی شست و شو  
بہرہ تھا دل یہاں سینے میں ہو ہو کر لہو  
چاندنا گلشن میں تھا ظلمت یہاں تھی چارو  
جلوہ گل نے کیا تھا واں چہراں آب جو  
یاں رواں شرکان چشم تر سے خون ناب تھا

سو گئے وہ سنتے سنتے قصہ خواں کی گفتگو  
اور یہاں برسا کیا تا صبح آنکھوں سے لہو  
فرش راحت پروئے تھے اور ہم پریشاں کو کو  
یاں مشورہ ریا کے خوابی سے تھا دیوار جو  
واں وہ فرقِ ناز جو بالِش کم خواب تھا

تھی یہاں کبھی کسی مونس وہاں مغل جمی  
تھا یہاں دل صرف غمِ عشرت وہاں درستی  
وہاں تھے شمعِ مغل تھی یہاں ک لٹو لگی  
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بخودی  
جلوہ گل واں بساطِ محبتِ احباب تھا

عیش میں وہ غوتے میں دردِ غم میں مبتلا  
وہ وہاں خنداں و فرحاں میں یہاں گمراہ کا  
وہ وہاں سرشارِ بادہ میں یہاں لبتاشہ تھا  
فرش سے تاعش واں طوفاں تھا صبحِ رنگ کا  
یاں زمیں سے آسمان تک سوختن کا باب تھا

شوقِ جب سے زیادہ مجھ کو ترپانے لگا  
سببِ سوزاں میں میرے لگ بھڑکانے لگا  
چپکے چپکے میں کچھ اپنے جی کو سمجھانے لگا  
ناگہاں اس رنگ سے خوابِ ٹپکانے لگا  
دلِ کر دوق کاوشِ ناخن سے لذتِ یاب تھا



شوق میں مضطرب مثالِ ماہی بے آب تھا      مضطرب ایسا کہ گویا برق تھا سیما بے تھا  
اسکی حالت سے پریشیاں جلسہ ہوا تھا      نالہ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا  
تھا سپندِ بزم وصل غیر گویتاب تھا

رہا دن نالہ ہی اس سے گوش زد تھے مثل نے      یاد ہی اسکے سوا گویا نہ تھی کچھ اور لے  
جوشِ گریہ کے سوا بھائی نہیں ہو کوئی تھے      مقدم سیلاب سے دل کی فاش طآہنگ ہے  
فائدہ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

اسکے ذرہ کی خاک کو طمس کہوں نہ کیا کہوں      اس زمین کے فرش کو یا فرشِ نخل کا کہوں  
ہے بجا قائم سے نرمی میں اگر اگلے کہوں      نازشِ ایام خاکستر نشینی کیا کہوں  
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ نہاب تھا

تھا اسی کے نور کا ہر چیز میں جلوہ عیاں      ہو گیا کچھ پردہ غفلت ہی عاملِ درمیاں  
حیف ہے یونہی گئی محرابِ دیواریں گیاں      کچھ نہ کی اپنے جنوں نارمانے ورنہ یاں  
ذرہ ذرہ روشِ خورشید عالم تاب تھا

یاد ہے صبا داپنا وہ زمانہ بھی تجھے      آب و دانہ کی ہمائے فکر رہتی تھی تجھے  
بیکسو کے حال سے غفلت نہ تھی اتنی تجھے      آج کیوں پروا نہیں اپنے اہیر و نکی تجھے  
کل تلک تیرا ہی دل نہ وفا کا باب تھا

آخرے صیاد کیا ضد ہے تجھے کچھ تو بتا      دیکھ کر مجھ کو جو تونے دام اکٹھا کر لیا  
شوق سے یوں تیرے پھنڈ میں کوئی آیا بھی تھا      یاد کرو وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا  
انتظار صید میں اک دیدہ بنے خواب تھا

ہونے والا تھا بیا طوفان اسکے انگ سے      پوچھنے کیا ہو کہ اک اک قطرے دریا ہے  
خیریت ہی ہو گئی مرزا کہ آنسو ختم گئے      میں نے روکارات غالب کو گورنہ دیکھتے  
اکے سیل گریں گریں گریں کف سیلاب تھا



ہم جو چاہیں کسی ذرے کا بیاباں ہونا      ہے عبث چارہ و تدبیر میں حیراں ہونا  
معتنع کا سبھی ممکن نہیں امکاں ہونا      بسکر دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا  
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ابرفرگاں نے جو ٹھہرائی ہے رسالے کی      نوبت آئے نہ کسی دن کے بہر جانے کی  
شکل ہونے لگی ہر گوشے میں برائے کی      گویہ چاہے ہے خرابی مرے کاشلے کی  
درو دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

بس جو دل پر ہو میرا کچھ تو اسے روکوں تو      میں اس آواہ کا تا چند ہونگا دل جو  
اپنے انجام کو سوچوں یہ مجھے ہوش بھی ہو      وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو  
آپ جانا ادھر اور آپ ہی حیراں ہونا

بخت آئینہ تیرے حسن سے کیا چمکا ہے      سامنے آنکھوں کے پردہ بخیزیا ہے  
خود غمائی کا جو ہے شوق تو بجا کیا ہے      جلوہ از بس کرتا قضاے نگہ کرتا ہے  
جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مڑگاں ہونا

حاصل آنکھوں کو ہے جو ذوق کئی مت پوچھو      انبساط دل سرگرم تماشا مت پوچھو  
حسرتیں آج نکلنے کو ہیں کیا کیا مت پوچھو      عشرتِ قتلِ گہر اہل تماشا مت پوچھو  
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عسریاں ہونا

یوں تو ہر دل میں ہے کس دل میں ہیں نشاط      ہاں جگہ دل میں ہمارے ہی نہ کی وائے نشاط  
جیتے جی مر میں رہی جوشِ سودائے نشاط      سہ گئے خاک میں ہم داغِ تنائے نشاط  
تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشق نے ذوق ہر اک چیز کو بخشا ہے جدا      سینہ مشتاق سناں مرکو تبر کا سودا  
جان بیتاب کو ہے شوقِ فدا ہونے کا      عشرتِ پارہ دل زخمِ تنہا کھانا  
لذتِ ریشِ جگر غرقِ نسکداں ہونا

جیتے جی میرے نہ کی مکر و دغا سے توبہ      نہ تم سے نہ کسی جرم و خطا سے توبہ  
بھول کر بھی تو نہ کی خوفِ خدا سے توبہ      کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ  
ہائے اس زور و شیمان کا پشیمان ہونا

ہوتی ہے حضرت مرزا کو جو دشتِ غالب      پھر تو آجاتی ہے بلبوس کی شامتِ غالب  
جیبِ اس کی تو ہوتی ہے بُری گتِ غالب      جیت اس چارگرہ کپڑے کی قمیصِ غالب  
لے (ماثیر الجے مغویہ)

جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

۱۲

مجھ سے غم آشام کا احباب غم کھائیں گے کیا  
خوگر کلفت کو وہ آرام پہنچائیں گے کیا  
جوشِ وحشت کے ہوتے زخم سلوائیں گے کیا  
دوست غمخواری میں میری سخی فرمائیں گے کیا  
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھائیں گے کیا  
یہ جفاکاری روار کھوگے ہم پر کب تلک  
اس طرح مالوگے قصہ سن سنا کر کب تلک  
ہوگی آخر حاجتِ عرض مکر کب تلک  
بے نیازی حد سے گذری بندہ پر کب تلک  
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا  
دوست کیوں پند نصیحت پیتے ہیں خواہ خواہ  
مجھ کو کچھ دیوانہ سمجھا ہے کسی نے واہ واہ  
ہوں تحیر میں کہ آخر کیا ہوا مجھ سے گناہ  
حضرت نامح جو آئیں دیدہ و دل فرشتہ راہ  
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا  
قتل گہرے روز کو نہا کامیاب آتا ہوئی  
وقتِ عرضِ مدعا قاتل سے شرماتا ہوں میں  
دیکھئے تو راہ پر کینہ مکر انھیں لاتا ہوں میں  
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں  
غدر میرے قتل کرنے میں وہ ابلاویں گے کیا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: مرزا صاحب کو ایک دفعہ زنداں میں لگی جاتا پڑا۔ رہائی کے دن جب وہ چلنے لگے اور  
باس تبدیل کوئے کا سرِ تلخ آیا نوگرد وہیں پکار کر کہنے کا اور یہ شعر پڑھا ہے  
جیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گرہاں ہونا

چارہ سازوں نے جو زنجیروں باندھ لیں وہی ہے یہی بہانہ وحشت کا دوا یوں سہی  
ہو نہیں سکتا جو کوئی اور چارہ یوں سہی گر کیا نامح نے مجھ کو قید اچھا یوں سہی

یہ جنوں عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا  
ہتھکڑی اور طوق گردن گیر سجا گئے گیوں  
اس مناسب چارہ و تندی سے بھاگیں گے گیوں  
خاندان زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے گیوں  
ہیں گرفتار و فائزنداں سے گھبرائیں گے کیا

یوں تو ہے یہ شہر اک منزل گہہ شہر تہ اسد  
ہر طرف ہے عیش کے سامان کی کثرت اسد  
پیش ہے بایں ہمہ مرزا کو یہ دقت اسد  
ہے اب اس معمورہ میں قحط غم الفت اسد

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھاویں گے کیا

لے مرزا غالب نے یہ نہیں کہ یہ غزل کہی ہوگی مگر مقطع کے مصدقہ ثانی کا مضمون مندرجہ تحت خط سے وابستہ نظر آتا ہے جب  
کہ وہ معائب و مکرر سنی کا شمار ہو کر دلی کو خیر باد کہے کا ارادہ کر چکے تھے فرماتے ہیں :-

”خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے تنہے مجھے تنہیت ہی تو مبارک و میں نے تمہیں تنہیت دی تو مناسب الحمد للہ الشکو  
بھائی پر تو یوں ہے کہ ان دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر ہرگز بھجوں تو کہاں رہا نہ اٹھ نہیں سکتا ڈاک گھونٹ جائے کوں؟  
اپنا مقصود تھا کہ والدہ ماجدہ سے اور تہجاری جہہ ماجدہ اور تہا کے غم عالی مقدس کے کہ چکا ہوں، خلاصہ یہ کہ میری بیوی اور  
بچوں کو کہ یہ پہلی قوم کے ہیں مجھ سے ملے تو میں اب اس وجہ کا تحمل نہیں ہو سکتا، معصوم نے یہ بشرط ان لوگوں کے دوبارہ  
حاصل کے اس خواہش کو قبول کر لیا میرا مقصد سیاحت کا ہے، فیشن اگر کھل جائیگی تو وہ اپنے مرف میں لایا کروں گا جہاں ہی لگا  
وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکٹھ گیا چل دیا۔ مگر مرزا غالب صاحب نے اپنے خاندانی وقار کا پورا خیال خاطر رکھتے ہوئے دلی  
چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور وہ دلی سے ماہر گئے جیسا کہ ایک خط بانام حکیم غلام نجف خاں میں لکھے ہیں۔ بھائی میرا  
دکھ سنو، پٹیا لے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔“

ہمیں اس کی بزم میں اگر اذن بار ہوتا      دل غم زدہ نہ غم سے کبھی رشتکار ہوتا  
 شب و روز وقفِ حواں یہ امیدوار ہوتا      یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا  
 اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا  
 ہمیں پیشتر عیاں تھا ترا وعدہ پر نہ آنا      بس اب اور جھوٹا کہہ کر ہے عبتِ یقین لانا  
 نہ کہ اب یہ غدرِ بجانہ تراش کچھ بہانا      ترے وعدے پر جیتے ہم تو یہ جان چھو جانا  
 کہ خوشی سے مرنے جاتے اگر اعتبار ہوتا  
 یہ شکستِ عہدِ الفت ہے مقامِ حیرت افزا      کہ نہیں یہ کام ہرگز کسی تجھ سے نازنین کا  
 مگر اس قدر تو کھولا مرے دل نے یہ معما      تری ناز کی سے جانا کہ بندھا تھا عہدِ بودا  
 کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا  
 ترے ناوکِ ستم پر دل و جان فدا ہیں اب تو      کہ نہ کال دیں انھوں نے مری حسرتیں تھیں جو جو  
 جو ملا ہے لطف کاوش وہ زبان کیا بیان ہو      کوئی میرے دل سے پوچھے کسے تیرے کش کو  
 یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا  
 یہ نقطہ ملا ہی دل تھا یہ میرا ہی تھا طبعِ بیا      ہزار صبر و تمکین سمی آفتوں کو جھیلنا  
 کسی کو یہ میں کہاں ہے مرے سوزِ غم کا یارا      رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ ٹھننا  
 جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شہار ہوتا

یہ عجیب بات کی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
یہ انوکھی دل لگی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
کوئی چال یہ نئی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست نامح  
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

ہوا ضبط چارہ گر کو کہ جو تم سے مشتعل ہے  
نہیں دل کا کوئی چارہ جو غم سے مضطرب ہے  
نہیں سہل غم سے چھٹنا یہ شریکِ آبِ گل ہے  
غم اگر چہ جاگسل ہے پہ کہاں نہیں کہ دل ہے  
غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

نہیں شب ہی بھلکھو بجاری کہ دن اس بھی سول ہے  
وہ بلائے جاگسل ہے تو یہ دلوں جاں گزار ہے  
کبھی جاں لبوں پر آئی کبھی دم نکل گیا ہے  
کہوں کس سے میں کہ کیا ہر شب غم بری بٹ ہے  
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہیں تھا جو شوق جلوہ تو قصور فہم کا تھا  
ہے مقام شکر لیکن کہ خدا نے پردہ رکھا  
رہی شرم اپنی ورنہ کسے تھا نظر کا یار  
اے کون دیکھ سکتا کہ ریگانہ ہے وہ یکتا  
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ کسی پر اپنا مرنا ہوا کیصل دوستوں کا  
کہ لگا دیا ہے سب نے سر قبر ایک میل  
لگے اپنی جان سے ہم انھیں ہو گیا تماشا  
ہوئے مرے ہم جو رسوا ہوئے کیوں غرق دریا  
نہ کبھی جنازہ اٹھنا نہ کہیں مزار ہوتا

ہوئی معرفت میں گویا جو تری زبان غالب  
تو سمجھ گیا ہے مزار جو ہے تیری شان غالب  
کوئی اب بھی تجھ سے کیونکر رہے بوگیاں غالب  
یہ مسائلِ نصوص یہ ترا بیان غالب  
لے ماشیہ اعلا صفر

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بارہ خوار ہوتا

۱۳۷

بشر کرتا ہے بیجا ادعا کیا یہ کر سکتا ہے ترک مدعا کیا  
اسے تو دھن ہے ہوگا کیا ہوا کیا ہو س کو بے نشاط کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نہیں سمجھے ہو اب تک ماجرا کیا کہا کیا ہم نے اور تم نے سنا کیا  
مال آخر ہے استغوام کا کیا تجاہل پیشگی سے مدعا کیا

کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

عدو پر لطف دونا دیکھتا ہوں روابط بھی زیادہ دیکھتا ہوں  
مدارا میں اضافہ دیکھتا ہوں نواز شہائے بیجا دیکھتا ہوں

شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

بھنور ہیں نغمہ پردازانا لبحر عیاں موجوں سے آوازانا لبحر  
صبا بھر کو نازانا لبحر دل ہر قطرہ ہے سازانا لبحر

ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

ذرا اس بے زبان دل کی صدا سن کچھ اپنی قدر دانی کا گلہ سن

حاشیہ گزشتہ صفحہ کا: ظفر بادشاہ نے مطلع سنا تو کہا کہ تم تو اس وقت بھی نہ سمجھتے، قاتب نے کہا حضور تعالیٰ ہی ایسا  
ہی سمجھتے ہیں اسلئے ارشاد ہوا کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔ ۱۴



یہ عمل بے بہا کہتا ہے کیا سن      سن بے غارت گر جنس وفا سن  
شکست قیمت دل کی صد کیا

ہوائے سنبھل و سوسن نہیں ہے      طبیعت مائل گلشن نہیں ہے  
بسائیں کیا یہاں دامن نہیں ہے      دماغ عطسہ پیراہن نہیں ہے  
غم آوارگی ہائے صد کیا

کیا ہے کیوں جفا کاری کا دعوے      جتا یا کیوں تم گاری کا دعویٰ  
تجھے کیوں ہے دل آزاری کا دعویٰ      کیا کس نے جگر داری کا دعویٰ  
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

ابھی تک مئے کہاں ساقی نے دیا ہے      مگر حالت کمال نشہ کی ہے  
کسی کی چشم میگوں دیکھ لی ہے      نفس موج محیط بخود دی ہے  
تفاضل ہائے ساقی کا گلہ کیا

عبث دشمن کو جلوسے کی ہوس ہے      کہ اس کو اک نگاہ گرم بس ہے  
اسے کیا سوزش پہاں سے مس ہے      فروغ شعلہ رخس یک نفس ہے  
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

کبھی تو جو ہر تیغ نظر دیکھ      پھر اپنے جاں نثاروں کے جگر دیکھ  
نہیں الزام تجھ پر بے خطر دیکھ      مابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ  
شہیدان نگہ کا خوں بہا کیا

اس اپنی آرزو پر مرثا ہوں      کر نصب العین چشم سرمہ سا ہوں  
 ہم تن شوق نظر را ہوا ہوں      نگاہ بے مایا چاہتا ہوں  
 تغافل ہائے تمکین آزمایا

یہ ذکر جلوۂ فردا کیا کیوں      ابھی سے کر دیا محشر پیا کیوں  
 تغافل اس قدر رکھا روا کیوں      یہ قاتل وعدہ صبر آزمایوں  
 یہ کافرستہ طاقت ربایا

کہے کیا کوئی اس کی بات پر بات      کہے افسوں و جادو سرسرات  
 نہیں ہے کوئی مرزا بے اثر بات      بلائے جاں ہے غالب الکی ہر بات  
 عمارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۵

کون کہتا ہے کوئی عاشق شیدا نہ ہوا      ہاں یہ دعویٰ ہے کہ ہم سا کوئی ہو گا نہ ہوا  
 اپنی یکتائی کا دعویٰ ہمیں بے جا نہ ہوا      درخور قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا  
 پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

ہم سے رکھیں نہ یہ امید کبھی اہل کرم      بند ہے در تو کریں طوف صدا دیں پیہم  
 زعم ہے فریب یاں فقر و غنا پر ہر دم      بندگی میں بھی وہ آزاد و خود ہیں کہ ہم  
 اگلے پھر آئے دیر کعبہ اگر وا نہ ہوا

حسن کا تیرے زمانے میں ہے سکا ایسا      سلنے ماہ میں کوئی گھڑی جم دسکا  
ہ شرم سے ہر چہاں تاب بھی ہے رو بقنا      سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا

رو برو کوئی بت آئی نہ سیمانہ ہوا

کب تری آنکھ کے بیمار نے پہا ہا درماں      کب ہوا چارہ گروں سے دوا کا خواہاں  
چشم بد دور سے ہے یہ مرضِ راحتِ جاں      کم نہیں نازشِ ہمنامی چشمِ خواہاں

تیرا بیمار برا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

کیا فغاں ہے وہ فغاں جس سے کوئی دل نہ ہلا      کیا کہیں آہ پھر اس آہ کو جو ہونہ رسا  
ہے وہ فریادِ عبث جس سے کوئی گھر نہ جلا      سینے کا داغ ہے وہ نازک لبِ ننگ گیا

خاک کا زرق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

جھیلتا ہوں جو شب و روز غم و بے بلا      یہی مقصود تھا شاید کہ میری خلقت کا  
کوئی حرماں زندہ کیا روزِ ازل اور نہ تھا      نام کا میرے ہے جو دکھ کہ کسی کو نہ ملا

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ ہر پانہ ہوا

سن کے ذکرِ پیشِ قلب رہے صبر کی تاب      داستانِ شبِ غم اور نہ اڑے آنکھوں سے خواب  
سوزِ دل کا ہو بیاں اور گلبرگِ ہونہ کباب      ہر بین سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب

جزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچانہ ہوا

جرمِ مے میں نہ ہو جلوۂ میمنہ و مل      ذرہ ذرہ میں نہ ہو سیرِ بہا باں و سبل  
غنیہ گل میں نہ آجائے نظرِ گلشن و گل      قطرہ میں دھلا دکھائی نہ دے اوڑھڑوں گل

کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا  
مدتوں خط و کتابت رہی مزا اس سے تب کہیں قتل کا اقرار کیا تا تل نے  
آج کچھ قتل کے سامان بھی قتل میں ہوئے تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پورے  
دیکھنے ہم بھی گئے تھے یہ تماشا نہ ہوا

۱۶

بجا ہے تم کرو جو کچھ گلہ اپنے فدائی کا ادا اس سے نہ کچھ بھی ہو سکا حق آشنائی کا  
نہ پہونچا بزم تک تو غد ہے بید و پائی کا پئے نذرِ کرم خفہ ہے شرم نارسائی کا  
بچوں غلطیہ صدرنگ دعویٰ پارسائی کا

ابھی تک تو رہا پردہ تہا دی خوش دانی کا نہ ہو جائے کہیں دنیا میں شہرہ دلربائی کا  
کسی دن رنگ لائے گا یہ لپکا خود نمائی کا نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا یوفائی کا  
بہ بہر صدر نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا

ترے نور و ضیاء سے فیض ہر وہ ماہ کو پہونچا مگر حسرت کش اک میں ہی رہا تیری تمکلی کا  
ترے در پر جو سائل اُگیا خالی نہیں جاتا زکوٰۃ حسن دے لئے پیش کش کر ہر آسا  
چراغ خانہ درویش ہو کا سہ گدائی کا

ہمیں تو یہ تمنا تھی کہ سر ہو اور ترا خنجر سرِ مقتل کہا کس نے کہ لے قاتل رعایت کر  
یقیناً تجھ سے ہو گی باز پرس اسکی سرِ محشر نہ مارا جان کر بے جرم غافل تیری گردن پر

رہا مانند خون بے گنہ حق آشنائی کا  
 ۱۔ محمد الشریب سے شیوہ ملی سانی ہے      نہ قصہ درد کا لب پر نہ کچھ غم کی کہانی ہے  
 خموشی میں بسر ہوتی ہے اچھی زندگانی ہے      تمنائے زباں جو سپاس بے زبانی ہے  
 شرجس سے تقاضا شکوہ بے دست و پائی کا  
 مرے زخموں کی صورت سے جو ملی ہر طور گل ہے      اسی صورت کا صدقہ ہے کفر و قیمت گل ہے  
 مرے ہی خوں شدہ دل کا صدقہ حرمت گل ہے      وہی اک بات ہے جو یافنس اُن نکبت گل ہے  
 چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا  
 وفاداروں سے بھی تو نے جو بد عہدی کی ٹھہرائی      شکایت بے دہن لوگوں کے لب تک بھی تری آئی  
 حسینوں سے زبان طعن آخر تو نے کھلوائی      دہان ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی  
 دم تک بیوفہ چاہے تیری بے وفائی کا  
 نہ ہو گا ختم نامہ یوں تو چاہے جس قدر رکھ دے      پڑھے گا کون تو دفتر کے دفتر بھی اگر رکھ دے  
 مناسب ہے کہ مرزا کی طرح مصرع تر رکھ دے      نہ ملے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر رکھ دے  
 کہ حسرتِ سخن ہوں عرض ستم ہائے جدائی کا

چپ رہے تو اس کو راحت کا گال ہو جائیگا      جو گلہ دل کو بے دل ہی میں نہاں رہ جائیگا  
 جو بیاں سے مدد ملے رائیگاں ہو جائیگا      گردِ اندوہ و فرقت بیاں ہو جائے گا

بے تکلف داغِ مدہر دہان ہو جائے گا  
ہستِ خم ہے بیٹھنے لک کو کربِ اضطراب  
ہے شبِ مر میں طبیعت کو بلا کا بیچ و تاب  
رو و مدائیں کہیں پیدا نہ کرنے ماہِ تاب  
پر تو مہتابِ سیلِ فائماں ہو جائے گا

نراست میں ہے کس انداز سے وہ سیکبر  
سورہا ہے مست مہیا ہے جوانی بے خبر  
عاجبِ کم وریا میں ہوں یہ حالت کچھ کبر  
لے تولوں سوتے میں اسکے پاؤں کا بو گر  
ایسی باتوں سے وہ کافر دگماں ہو جائے گا

اگر دعویٰ ابتدا میں تھا بہت کچھ عشق کا  
عمر بھر الفت نباہیں گے یہ اپنا قصد تھا  
کچھ جب اس سے لڑی سب جو صلا جاتا ہا  
دل کو ہم صرف وفا تجھے تھے کیا معلوم تھا  
یعنی یہ پہلے ہی نذر امتحان ہو جائے گا

ری مرضی سے ہے وابستہ زمانے کی ضیا  
اس سے دنیا پھر گئی تو جس سونا خوش ہو گیا  
نے چاہا جس کو مقبولِ دو عالم کر دیا  
سب دل میں ہے جگ تیری جو تو راضی ہوا  
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

جو مجھ کو فرطِ غم میں یں ہی خوں رنے کا خط  
اور کھلے میں رہا یوں ہی جگر اور دل کو ربط  
یہ نہ ہو جائیئے دونوں کے دونوں و خط  
گزر گاہ گرم فرماتی رہی تعلیم ضبط  
شعلہ خس میں جیسے خوں لگ میں نہاں ہو جائے گا

کچھ کرنا لاں مجھے مرغِ چین میں نومِ گر  
میری حالت پر کیفِ افسوس میں برگِ شجر  
وہائیں چاک چاک غم سرخوئوں کے بگر  
باغ میں مجھ کو نہ لے جاو نہ میرے حال پر  
مگر تیرا اک شتمِ خوں فشار ہو جائے گا

منتظر میں بھی ہوں فوائے قیامت لائے تو      اپنی اپنی دوا اسی دن پائیں گے انصاف جو  
 اک بڑی امید پر جمیلا ہے تیرے ظلم کو      وائے مگر میرا ترا انصاف عشرت میں نہ ہو  
 اب تلک تو یہ توقع تھی کہ وائے ہو جائیگا  
 باد رکھ سننے کے قابل پذیر مرزا ہے اسد      ہوش میں آگیا ہوا دل کس کو دیتا ہر اسد  
 بتلا اک طفل پر ہونا کچھ اچھا ہے اسد      فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسد  
 دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائیگا

یوں تو میرا علاج کیا نہ ہوا      کم مرض ہے مگر خرا نہ ہوا  
 مجھ پر احساں طیب کا نہ ہوا      درد منت کش دوا نہ ہوا  
 میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
 ہو گئے رسوا تمہیں کہا مانو      بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو  
 چل کے سن لو الگ جو سنتے ہو      جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو  
 اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اس غزل کے متعلق مرزا غالب نے غزلیات علی قہر کو لکھا ہے۔

میرا کلام میسے پاس کبھی نہیں رہا، غیاث الدین خاں اور حسین مرزا جمع کر لیتے تھے جو میں سے کہ انہوں نے  
 لکھ لیا۔ ان دونوں کے گھر لٹ گئے ہزاروں روپے کے کتب خانے برباد ہوئے۔ اب میں اپنے کلام کو دیکھنے کو نرسا  
 ہوں۔ کئی دن ہوئے ایک فقیر کہ وہ خوش آواز بھی ہے اور غمر پر داز بھی ہے ایک غزل میری کہیں سے نکھو  
 لایا۔ اس نے وہ کاغذ جو مجھ کو دکھایا یقیناً مجھ کا کہ جو کوروا آیا۔ غزل تم کو بھیضا ہوں اور صبر میں اس کے اس خط  
 کا جواب چاہتا ہوں۔ اور خط کے ساتھ مندرجہ بالا غزل بھیجی تھی۔ درد منت کش دوا نہ ہوا۔ ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ۱۰۲۔ ۱۰۳۔ ۱۰۴۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶۔ ۱۰۷۔ ۱۰۸۔ ۱۰۹۔ ۱۱۰۔ ۱۱۱۔ ۱۱۲۔ ۱۱۳۔ ۱۱۴۔ ۱۱۵۔ ۱۱۶۔ ۱۱۷۔ ۱۱۸۔ ۱۱۹۔ ۱۲۰۔ ۱۲۱۔ ۱۲۲۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ ۱۲۶۔ ۱۲۷۔ ۱۲۸۔ ۱۲۹۔ ۱۳۰۔ ۱۳۱۔ ۱۳۲۔ ۱۳۳۔ ۱۳۴۔ ۱۳۵۔ ۱۳۶۔ ۱۳۷۔ ۱۳۸۔ ۱۳۹۔ ۱۴۰۔ ۱۴۱۔ ۱۴۲۔ ۱۴۳۔ ۱۴۴۔ ۱۴۵۔ ۱۴۶۔ ۱۴۷۔ ۱۴۸۔ ۱۴۹۔ ۱۵۰۔ ۱۵۱۔ ۱۵۲۔ ۱۵۳۔ ۱۵۴۔ ۱۵۵۔ ۱۵۶۔ ۱۵۷۔ ۱۵۸۔ ۱۵۹۔ ۱۶۰۔ ۱۶۱۔ ۱۶۲۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴۔ ۱۶۵۔ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸۔ ۱۶۹۔ ۱۷۰۔ ۱۷۱۔ ۱۷۲۔ ۱۷۳۔ ۱۷۴۔ ۱۷۵۔ ۱۷۶۔ ۱۷۷۔ ۱۷۸۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۱۔ ۱۸۲۔ ۱۸۳۔ ۱۸۴۔ ۱۸۵۔ ۱۸۶۔ ۱۸۷۔ ۱۸۸۔ ۱۸۹۔ ۱۹۰۔ ۱۹۱۔ ۱۹۲۔ ۱۹۳۔ ۱۹۴۔ ۱۹۵۔ ۱۹۶۔ ۱۹۷۔ ۱۹۸۔ ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ ۲۰۱۔ ۲۰۲۔ ۲۰۳۔ ۲۰۴۔ ۲۰۵۔ ۲۰۶۔ ۲۰۷۔ ۲۰۸۔ ۲۰۹۔ ۲۱۰۔ ۲۱۱۔ ۲۱۲۔ ۲۱۳۔ ۲۱۴۔ ۲۱۵۔ ۲۱۶۔ ۲۱۷۔ ۲۱۸۔ ۲۱۹۔ ۲۲۰۔ ۲۲۱۔ ۲۲۲۔ ۲۲۳۔ ۲۲۴۔ ۲۲۵۔ ۲۲۶۔ ۲۲۷۔ ۲۲۸۔ ۲۲۹۔ ۲۳۰۔ ۲۳۱۔ ۲۳۲۔ ۲۳۳۔ ۲۳۴۔ ۲۳۵۔ ۲۳۶۔ ۲۳۷۔ ۲۳۸۔ ۲۳۹۔ ۲۴۰۔ ۲۴۱۔ ۲۴۲۔ ۲۴۳۔ ۲۴۴۔ ۲۴۵۔ ۲۴۶۔ ۲۴۷۔ ۲۴۸۔ ۲۴۹۔ ۲۵۰۔ ۲۵۱۔ ۲۵۲۔ ۲۵۳۔ ۲۵۴۔ ۲۵۵۔ ۲۵۶۔ ۲۵۷۔ ۲۵۸۔ ۲۵۹۔ ۲۶۰۔ ۲۶۱۔ ۲۶۲۔ ۲۶۳۔ ۲۶۴۔ ۲۶۵۔ ۲۶۶۔ ۲۶۷۔ ۲۶۸۔ ۲۶۹۔ ۲۷۰۔ ۲۷۱۔ ۲۷۲۔ ۲۷۳۔ ۲۷۴۔ ۲۷۵۔ ۲۷۶۔ ۲۷۷۔ ۲۷۸۔ ۲۷۹۔ ۲۸۰۔ ۲۸۱۔ ۲۸۲۔ ۲۸۳۔ ۲۸۴۔ ۲۸۵۔ ۲۸۶۔ ۲۸۷۔ ۲۸۸۔ ۲۸۹۔ ۲۹۰۔ ۲۹۱۔ ۲۹۲۔ ۲۹۳۔ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ ۲۹۶۔ ۲۹۷۔ ۲۹۸۔ ۲۹۹۔ ۳۰۰۔ ۳۰۱۔ ۳۰۲۔ ۳۰۳۔ ۳۰۴۔ ۳۰۵۔ ۳۰۶۔ ۳۰۷۔ ۳۰۸۔ ۳۰۹۔ ۳۱۰۔ ۳۱۱۔ ۳۱۲۔ ۳۱۳۔ ۳۱۴۔ ۳۱۵۔ ۳۱۶۔ ۳۱۷۔ ۳۱۸۔ ۳۱۹۔ ۳۲۰۔ ۳۲۱۔ ۳۲۲۔ ۳۲۳۔ ۳۲۴۔ ۳۲۵۔ ۳۲۶۔ ۳۲۷۔ ۳۲۸۔ ۳۲۹۔ ۳۳۰۔ ۳۳۱۔ ۳۳۲۔ ۳۳۳۔ ۳۳۴۔ ۳۳۵۔ ۳۳۶۔ ۳۳۷۔ ۳۳۸۔ ۳۳۹۔ ۳۴۰۔ ۳۴۱۔ ۳۴۲۔ ۳۴۳۔ ۳۴۴۔ ۳۴۵۔ ۳۴۶۔ ۳۴۷۔ ۳۴۸۔ ۳۴۹۔ ۳۵۰۔ ۳۵۱۔ ۳۵۲۔ ۳۵۳۔ ۳۵۴۔ ۳۵۵۔ ۳۵۶۔ ۳۵۷۔ ۳۵۸۔ ۳۵۹۔ ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ۳۶۲۔ ۳۶۳۔ ۳۶۴۔ ۳۶۵۔ ۳۶۶۔ ۳۶۷۔ ۳۶۸۔ ۳۶۹۔ ۳۷۰۔ ۳۷۱۔ ۳۷۲۔ ۳۷۳۔ ۳۷۴۔ ۳۷۵۔ ۳۷۶۔ ۳۷۷۔ ۳۷۸۔ ۳۷۹۔ ۳۸۰۔ ۳۸۱۔ ۳۸۲۔ ۳۸۳۔ ۳۸۴۔ ۳۸۵۔ ۳۸۶۔ ۳۸۷۔ ۳۸۸۔ ۳۸۹۔ ۳۹۰۔ ۳۹۱۔ ۳۹۲۔ ۳۹۳۔ ۳۹۴۔ ۳۹۵۔ ۳۹۶۔ ۳۹۷۔ ۳۹۸۔ ۳۹۹۔ ۴۰۰۔ ۴۰۱۔ ۴۰۲۔ ۴۰۳۔ ۴۰۴۔ ۴۰۵۔ ۴۰۶۔ ۴۰۷۔ ۴۰۸۔ ۴۰۹۔ ۴۱۰۔ ۴۱۱۔ ۴۱۲۔ ۴۱۳۔ ۴۱۴۔ ۴۱۵۔ ۴۱۶۔ ۴۱۷۔ ۴۱۸۔ ۴۱۹۔ ۴۲۰۔ ۴۲۱۔ ۴۲۲۔ ۴۲۳۔ ۴۲۴۔ ۴۲۵۔ ۴۲۶۔ ۴۲۷۔ ۴۲۸۔ ۴۲۹۔ ۴۳۰۔ ۴۳۱۔ ۴۳۲۔ ۴۳۳۔ ۴۳۴۔ ۴۳۵۔ ۴۳۶۔ ۴۳۷۔ ۴۳۸۔ ۴۳۹۔ ۴۴۰۔ ۴۴۱۔ ۴۴۲۔ ۴۴۳۔ ۴۴۴۔ ۴۴۵۔ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔ ۴۴۸۔ ۴۴۹۔ ۴۵۰۔ ۴۵۱۔ ۴۵۲۔ ۴۵۳۔ ۴۵۴۔ ۴۵۵۔ ۴۵۶۔ ۴۵۷۔ ۴۵۸۔ ۴۵۹۔ ۴۶۰۔ ۴۶۱۔ ۴۶۲۔ ۴۶۳۔ ۴۶۴۔ ۴۶۵۔ ۴۶۶۔ ۴۶۷۔ ۴۶۸۔ ۴۶۹۔ ۴۷۰۔ ۴۷۱۔ ۴۷۲۔ ۴۷۳۔ ۴۷۴۔ ۴۷۵۔ ۴۷۶۔ ۴۷۷۔ ۴۷۸۔ ۴۷۹۔ ۴۸۰۔ ۴۸۱۔ ۴۸۲۔ ۴۸۳۔ ۴۸۴۔ ۴۸۵۔ ۴۸۶۔ ۴۸۷۔ ۴۸۸۔ ۴۸۹۔ ۴۹۰۔ ۴۹۱۔ ۴۹۲۔ ۴۹۳۔ ۴۹۴۔ ۴۹۵۔ ۴۹۶۔ ۴۹۷۔ ۴۹۸۔ ۴۹۹۔ ۵۰۰۔ ۵۰۱۔ ۵۰۲۔ ۵۰۳۔ ۵۰۴۔ ۵۰۵۔ ۵۰۶۔ ۵۰۷۔ ۵۰۸۔ ۵۰۹۔ ۵۱۰۔ ۵۱۱۔ ۵۱۲۔ ۵۱۳۔ ۵۱۴۔ ۵۱۵۔ ۵۱۶۔ ۵۱۷۔ ۵۱۸۔ ۵۱۹۔ ۵۲۰۔ ۵۲۱۔ ۵۲۲۔ ۵۲۳۔ ۵۲۴۔ ۵۲۵۔ ۵۲۶۔ ۵۲۷۔ ۵۲۸۔ ۵۲۹۔ ۵۳۰۔ ۵۳۱۔ ۵۳۲۔ ۵۳۳۔ ۵۳۴۔ ۵۳۵۔ ۵۳۶۔ ۵۳۷۔ ۵۳۸۔ ۵۳۹۔ ۵۴۰۔ ۵۴۱۔ ۵۴۲۔ ۵۴۳۔ ۵۴۴۔ ۵۴۵۔ ۵۴۶۔ ۵۴۷۔ ۵۴۸۔ ۵۴۹۔ ۵۵۰۔ ۵۵۱۔ ۵۵۲۔ ۵۵۳۔ ۵۵۴۔ ۵۵۵۔ ۵۵۶۔ ۵۵۷۔ ۵۵۸۔ ۵۵۹۔ ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ ۵۶۲۔ ۵۶۳۔ ۵۶۴۔ ۵۶۵۔ ۵۶۶۔ ۵۶۷۔ ۵۶۸۔ ۵۶۹۔ ۵۷۰۔ ۵۷۱۔ ۵۷۲۔ ۵۷۳۔ ۵۷۴۔ ۵۷۵۔ ۵۷۶۔ ۵۷۷۔ ۵۷۸۔ ۵۷۹۔ ۵۸۰۔ ۵۸۱۔ ۵۸۲۔ ۵۸۳۔ ۵۸۴۔ ۵۸۵۔ ۵۸۶۔ ۵۸۷۔ ۵۸۸۔ ۵۸۹۔ ۵۹۰۔ ۵۹۱۔ ۵۹۲۔ ۵۹۳۔ ۵۹۴۔ ۵۹۵۔ ۵۹۶۔ ۵۹۷۔ ۵۹۸۔ ۵۹۹۔ ۶۰۰۔ ۶۰۱۔ ۶۰۲۔ ۶۰۳۔ ۶۰۴۔ ۶۰۵۔ ۶۰۶۔ ۶۰۷۔ ۶۰۸۔ ۶۰۹۔ ۶۱۰۔ ۶۱۱۔ ۶۱۲۔ ۶۱۳۔ ۶۱۴۔ ۶۱۵۔ ۶۱۶۔ ۶۱۷۔ ۶۱۸۔ ۶۱۹۔ ۶۲۰۔ ۶۲۱۔ ۶۲۲۔ ۶۲۳۔ ۶۲۴۔ ۶۲۵۔ ۶۲۶۔ ۶۲۷۔ ۶۲۸۔ ۶۲۹۔ ۶۳۰۔ ۶۳۱۔ ۶۳۲۔ ۶۳۳۔ ۶۳۴۔ ۶۳۵۔ ۶۳۶۔ ۶۳۷۔ ۶۳۸۔ ۶۳۹۔ ۶۴۰۔ ۶۴۱۔ ۶۴۲۔ ۶۴۳۔ ۶۴۴۔ ۶۴۵۔ ۶۴۶۔ ۶۴۷۔ ۶۴۸۔ ۶۴۹۔ ۶۵۰۔ ۶۵۱۔ ۶۵۲۔ ۶۵۳۔ ۶۵۴۔ ۶۵۵۔ ۶۵۶۔ ۶۵۷۔ ۶۵۸۔ ۶۵۹۔ ۶۶۰۔ ۶۶۱۔ ۶۶۲۔ ۶۶۳۔ ۶۶۴۔ ۶۶۵۔ ۶۶۶۔ ۶۶۷۔ ۶۶۸۔ ۶۶۹۔ ۶۷۰۔ ۶۷۱۔ ۶۷۲۔ ۶۷۳۔ ۶۷۴۔ ۶۷۵۔ ۶۷۶۔ ۶۷۷۔ ۶۷۸۔ ۶۷۹۔ ۶۸۰۔ ۶۸۱۔ ۶۸۲۔ ۶۸۳۔ ۶۸۴۔ ۶۸۵۔ ۶۸۶۔ ۶۸۷۔ ۶۸۸۔ ۶۸۹۔ ۶۹۰۔ ۶۹۱۔ ۶۹۲۔ ۶۹۳۔ ۶۹۴۔ ۶۹۵۔ ۶۹۶۔ ۶۹۷۔ ۶۹۸۔ ۶۹۹۔ ۷۰۰۔ ۷۰۱۔ ۷۰۲۔ ۷۰۳۔ ۷۰۴۔ ۷۰۵۔ ۷۰۶۔ ۷۰۷۔ ۷۰۸۔ ۷۰۹۔ ۷۱۰۔ ۷۱۱۔ ۷۱۲۔ ۷۱۳۔ ۷۱۴۔ ۷۱۵۔ ۷۱۶۔ ۷۱۷۔ ۷۱۸۔ ۷۱۹۔ ۷۲۰۔ ۷۲۱۔ ۷۲۲۔ ۷۲۳۔ ۷۲۴۔ ۷۲۵۔ ۷۲۶۔ ۷۲۷۔ ۷۲۸۔ ۷۲۹۔ ۷۳۰۔ ۷۳۱۔ ۷۳۲۔ ۷۳۳۔ ۷۳۴۔ ۷۳۵۔ ۷۳۶۔ ۷۳۷۔ ۷۳۸۔ ۷۳۹۔ ۷۴۰۔ ۷۴۱۔ ۷۴۲۔ ۷۴۳۔ ۷۴۴۔ ۷۴۵۔ ۷۴۶۔ ۷۴۷۔ ۷۴۸۔ ۷۴۹۔ ۷۵۰۔ ۷۵۱۔ ۷۵۲۔ ۷۵۳۔ ۷۵۴۔ ۷۵۵۔ ۷۵۶۔ ۷۵۷۔ ۷۵۸۔ ۷۵۹۔ ۷۶۰۔ ۷۶۱۔ ۷۶۲۔ ۷۶۳۔ ۷۶۴۔ ۷۶۵۔ ۷۶۶۔ ۷۶۷۔ ۷۶۸۔ ۷۶۹۔ ۷۷۰۔ ۷۷۱۔ ۷۷۲۔ ۷۷۳۔ ۷۷۴۔ ۷۷۵۔ ۷۷۶۔ ۷۷۷۔ ۷۷۸۔ ۷۷۹۔ ۷۸۰۔ ۷۸۱۔ ۷۸۲۔ ۷۸۳۔ ۷۸۴۔ ۷۸۵۔ ۷۸۶۔ ۷۸۷۔ ۷۸۸۔ ۷۸۹۔ ۷۹۰۔ ۷۹۱۔ ۷۹۲۔ ۷۹۳۔ ۷۹۴۔ ۷۹۵۔ ۷۹۶۔ ۷۹۷۔ ۷۹۸۔ ۷۹۹۔ ۸۰۰۔ ۸۰۱۔ ۸۰۲۔ ۸۰۳۔ ۸۰۴۔ ۸۰۵۔ ۸۰۶۔ ۸۰۷۔ ۸۰۸۔ ۸۰۹۔ ۸۱۰۔ ۸۱۱۔ ۸۱۲۔ ۸۱۳۔ ۸۱۴۔ ۸۱۵۔ ۸۱۶۔ ۸۱۷۔ ۸۱۸۔ ۸۱۹۔ ۸۲۰۔ ۸۲۱۔ ۸۲۲۔ ۸۲۳۔ ۸۲۴۔ ۸۲۵۔ ۸۲۶۔ ۸۲۷۔ ۸۲۸۔ ۸۲۹۔ ۸۳۰۔ ۸۳۱۔ ۸۳۲۔ ۸۳۳۔ ۸۳۴۔ ۸۳۵۔ ۸۳۶۔ ۸۳۷۔ ۸۳۸۔ ۸۳۹۔ ۸۴۰۔ ۸۴۱۔ ۸۴۲۔ ۸۴۳۔ ۸۴۴۔ ۸۴۵۔ ۸۴۶۔ ۸۴۷۔ ۸۴۸۔ ۸۴۹۔ ۸۵۰۔ ۸۵۱۔ ۸۵۲۔ ۸۵۳۔ ۸۵۴۔ ۸۵۵۔ ۸۵۶۔ ۸۵۷۔ ۸۵۸۔ ۸۵۹۔ ۸۶۰۔ ۸۶۱۔ ۸۶۲۔ ۸۶۳۔ ۸۶۴۔ ۸۶۵۔ ۸۶۶۔ ۸۶۷۔ ۸۶۸۔ ۸۶۹۔ ۸۷۰۔ ۸۷۱۔ ۸۷۲۔ ۸۷۳۔ ۸۷۴۔ ۸۷۵۔ ۸۷۶۔ ۸۷۷۔ ۸۷۸۔ ۸۷۹۔ ۸۸۰۔ ۸۸۱۔ ۸۸۲۔ ۸۸۳۔ ۸۸۴۔ ۸۸۵۔ ۸۸۶۔ ۸۸۷۔ ۸۸۸۔ ۸۸۹۔ ۸۹۰۔ ۸۹۱۔ ۸۹۲۔ ۸۹۳۔ ۸۹۴۔ ۸۹۵۔ ۸۹۶۔ ۸۹۷۔ ۸۹۸۔ ۸۹۹۔ ۹۰۰۔ ۹۰۱۔ ۹۰۲۔ ۹۰۳۔ ۹۰۴۔ ۹۰۵۔ ۹۰۶۔ ۹۰۷۔ ۹۰۸۔ ۹۰۹۔ ۹۱۰۔ ۹۱۱۔ ۹۱۲۔ ۹۱۳۔ ۹۱۴۔ ۹۱۵۔ ۹۱۶۔ ۹۱۷۔ ۹۱۸۔ ۹۱۹۔ ۹۲۰۔ ۹۲۱۔ ۹۲۲۔ ۹۲۳۔ ۹۲۴۔ ۹۲۵۔ ۹۲۶۔ ۹۲۷۔ ۹۲۸۔ ۹۲۹۔ ۹۳۰۔ ۹۳۱۔ ۹۳۲۔ ۹۳۳۔ ۹۳۴۔ ۹۳۵۔ ۹۳۶۔ ۹۳۷۔ ۹۳۸۔ ۹۳۹۔ ۹۴۰۔ ۹۴۱۔ ۹۴۲۔ ۹۴۳۔ ۹۴۴۔ ۹۴۵۔ ۹۴۶۔ ۹۴۷۔ ۹۴۸۔ ۹۴۹۔ ۹۵۰۔ ۹۵۱۔ ۹۵۲۔ ۹۵۳۔ ۹۵۴۔ ۹۵۵۔ ۹۵۶۔ ۹۵۷۔ ۹۵۸۔ ۹۵۹۔ ۹۶۰۔ ۹۶۱۔ ۹۶۲۔ ۹۶۳۔ ۹۶۴۔ ۹۶۵۔ ۹۶۶۔ ۹۶۷۔ ۹۶۸۔ ۹۶۹۔ ۹۷۰۔ ۹۷۱۔ ۹۷۲۔ ۹۷۳۔ ۹۷۴۔ ۹۷۵۔ ۹۷۶۔ ۹۷۷۔ ۹۷۸۔ ۹۷۹۔ ۹۸۰۔ ۹۸۱۔ ۹۸۲۔ ۹۸۳۔ ۹۸۴۔ ۹۸۵۔ ۹۸۶۔ ۹۸۷۔ ۹۸۸۔ ۹۸۹۔ ۹۹۰۔ ۹۹۱۔ ۹۹۲۔ ۹۹۳۔ ۹۹۴۔ ۹۹۵۔ ۹۹۶۔ ۹۹۷۔ ۹۹۸۔ ۹۹۹۔ ۱۰۰۰۔ ۱۰۰۱۔ ۱۰۰۲۔ ۱۰۰۳۔ ۱۰۰۴۔ ۱۰۰۵۔ ۱۰۰۶۔ ۱۰۰۷۔ ۱۰۰۸۔ ۱۰۰۹۔ ۱۰۱۰۔ ۱۰۱۱۔ ۱۰۱۲۔ ۱۰۱۳۔ ۱۰۱۴۔ ۱۰۱۵۔ ۱۰۱۶۔ ۱۰۱۷۔ ۱۰۱۸۔ ۱۰۱۹۔ ۱۰۲۰۔ ۱۰۲۱۔ ۱۰۲۲۔ ۱۰۲۳۔ ۱۰۲۴۔ ۱۰۲۵۔ ۱۰۲۶۔ ۱۰۲۷۔ ۱۰۲۸۔ ۱۰۲۹۔ ۱۰۳۰۔ ۱۰۳۱۔ ۱۰۳۲۔ ۱۰۳۳۔ ۱۰۳۴۔ ۱۰۳۵۔ ۱۰۳۶۔ ۱۰۳۷۔ ۱۰۳۸۔ ۱۰۳۹۔ ۱۰۴۰۔ ۱۰۴۱۔ ۱۰۴۲۔ ۱۰۴۳۔ ۱۰۴۴۔ ۱۰۴۵۔ ۱۰۴۶۔ ۱۰۴۷۔ ۱۰۴۸۔ ۱۰۴۹۔ ۱۰۵۰۔ ۱۰۵۱۔ ۱۰۵۲۔ ۱۰۵۳۔ ۱۰۵۴۔ ۱۰۵۵۔ ۱۰۵۶۔ ۱۰۵۷۔ ۱۰۵۸۔ ۱۰۵۹۔ ۱۰۶۰۔ ۱۰۶۱۔ ۱۰۶۲۔ ۱۰۶۳۔ ۱۰۶۴۔ ۱۰۶۵۔ ۱۰۶۶۔ ۱۰۶۷۔ ۱۰۶۸۔ ۱۰۶۹۔ ۱۰۷۰۔ ۱۰۷۱۔ ۱۰۷۲۔ ۱۰۷۳۔ ۱۰۷۴۔ ۱۰۷۵۔ ۱۰۷۶۔ ۱۰۷۷۔ ۱۰۷۸۔ ۱۰۷۹۔ ۱۰۸۰۔ ۱۰۸۱۔ ۱۰۸۲۔ ۱۰۸۳۔ ۱۰۸۴۔ ۱۰۸۵۔ ۱۰۸۶۔ ۱۰۸۷۔ ۱۰۸۸۔ ۱۰۸۹۔ ۱۰۹۰۔ ۱۰۹۱۔ ۱۰۹۲۔ ۱۰۹۳۔ ۱۰۹۴۔ ۱۰۹۵۔ ۱۰۹۶۔ ۱۰۹۷۔ ۱۰۹۸۔ ۱۰۹۹۔ ۱۱۰۰۔ ۱۱۰۱۔ ۱۱۰۲۔ ۱۱۰۳۔ ۱۱۰۴۔ ۱۱۰۵۔ ۱۱۰۶۔ ۱۱۰۷۔ ۱۱۰۸۔ ۱۱۰۹۔ ۱۱۱۰۔ ۱۱۱۱۔ ۱۱۱۲۔ ۱۱۱۳۔ ۱۱۱۴۔ ۱۱۱۵۔ ۱۱۱۶۔ ۱۱۱۷۔ ۱۱۱۸۔ ۱۱۱۹۔ ۱۱۲۰۔ ۱۱۲۱۔ ۱۱۲۲۔ ۱۱۲۳۔ ۱۱۲۴۔ ۱۱۲۵۔ ۱۱۲۶۔ ۱۱۲۷۔ ۱۱۲۸۔ ۱۱۲۹۔ ۱۱۳۰۔ ۱۱۳۱۔ ۱۱۳۲۔ ۱۱۳۳۔ ۱۱۳۴۔ ۱۱۳۵۔ ۱۱۳۶۔ ۱۱۳۷۔ ۱۱۳۸۔ ۱۱۳۹۔ ۱۱۴۰۔ ۱۱۴۱۔ ۱۱۴۲۔ ۱۱۴۳۔ ۱۱۴۴۔ ۱۱۴۵۔ ۱۱۴۶۔ ۱۱۴۷۔ ۱۱۴۸۔ ۱۱۴۹۔ ۱۱۵۰۔ ۱۱۵۱۔ ۱۱۵۲۔ ۱۱۵۳۔ ۱۱۵۴۔ ۱۱۵۵۔ ۱۱۵۶۔ ۱۱۵۷۔ ۱۱۵۸۔ ۱۱۵۹۔ ۱۱۶۰۔ ۱۱۶۱۔ ۱۱۶۲۔ ۱۱۶۳۔ ۱۱۶۴۔ ۱۱۶۵۔ ۱۱۶۶۔ ۱۱۶۷۔ ۱۱۶۸۔ ۱۱۶۹۔ ۱۱۷۰۔ ۱۱۷۱۔ ۱۱۷۲۔ ۱۱۷۳۔ ۱۱۷۴۔ ۱۱۷۵۔ ۱۱۷۶۔ ۱۱۷۷۔ ۱۱۷۸۔ ۱۱۷۹۔ ۱۱۸۰۔ ۱۱۸۱۔ ۱۱۸۲۔ ۱۱۸۳۔ ۱۱۸۴۔ ۱۱۸۵۔ ۱۱۸۶۔ ۱۱۸۷۔ ۱۱۸۸۔ ۱۱۸۹۔ ۱۱۹۰۔ ۱۱۹۱۔ ۱۱۹۲۔ ۱۱۹۳۔ ۱۱۹۴۔ ۱۱۹۵۔ ۱۱۹۶۔ ۱۱۹۷۔ ۱۱۹۸۔ ۱۱۹۹۔ ۱۲۰۰۔ ۱۲۰۱۔ ۱۲۰۲۔ ۱۲۰۳۔ ۱۲۰۴۔ ۱۲۰۵۔ ۱۲۰۶۔ ۱۲۰۷۔ ۱۲۰۸۔ ۱۲۰۹۔ ۱۲۱۰۔ ۱۲۱۱۔ ۱۲۱۲۔ ۱۲۱۳۔ ۱۲۱۴۔ ۱۲۱۵۔ ۱۲۱۶۔ ۱۲۱۷۔ ۱۲۱۸۔ ۱۲۱۹۔ ۱۲۲۰۔ ۱۲۲۱۔ ۱۲۲۲۔ ۱۲۲۳۔ ۱۲۲۴۔ ۱۲۲۵۔ ۱۲۲۶۔ ۱۲۲۷۔ ۱۲۲۸۔ ۱۲۲۹۔ ۱۲۳۰۔ ۱۲۳۱۔ ۱۲۳۲۔ ۱۲۳۳۔ ۱۲۳۴۔ ۱۲۳۵۔ ۱۲۳۶۔ ۱۲۳۷۔ ۱۲۳۸۔ ۱۲۳۹۔ ۱۲۴۰۔ ۱۲۴۱۔ ۱۲۴۲۔ ۱۲۴۳۔ ۱۲۴۴۔ ۱۲۴۵۔ ۱۲۴۶۔ ۱۲۴۷۔ ۱۲۴۸۔ ۱۲۴۹۔ ۱۲۵۰۔ ۱۲۵۱۔ ۱۲۵۲۔ ۱۲۵۳۔ ۱۲۵۴۔ ۱۲۵۵۔ ۱۲۵۶۔ ۱۲۵۷۔ ۱۲۵۸۔ ۱۲۵۹۔ ۱۲۶۰۔ ۱۲۶۱۔ ۱۲۶۲۔ ۱۲۶۳۔ ۱۲۶۴۔ ۱۲۶۵۔ ۱۲۶۶۔ ۱۲۶۷۔ ۱۲۶۸۔ ۱۲۶۹۔ ۱۲۷۰۔ ۱۲۷۱۔ ۱۲۷۲۔ ۱۲۷۳۔ ۱۲۷۴۔ ۱۲۷۵۔ ۱۲۷۶۔ ۱۲۷۷۔ ۱۲۷۸۔ ۱۲۷۹۔ ۱۲۸۰۔ ۱۲۸۱۔ ۱۲۸۲۔ ۱۲۸۳۔ ۱۲۸۴۔ ۱۲۸۵۔ ۱۲۸۶۔ ۱۲۸۷۔ ۱۲۸۸۔ ۱۲۸۹۔ ۱۲۹۰۔ ۱۲۹۱۔ ۱۲۹۲۔ ۱۲۹۳۔ ۱۲۹۴۔ ۱۲۹۵۔ ۱۲۹۶۔ ۱۲۹۷۔ ۱۲۹۸۔ ۱۲۹۹۔ ۱۳۰۰۔ ۱۳۰۱۔ ۱۳۰۲۔ ۱۳۰۳۔ ۱۳۰۴۔ ۱۳۰۵۔ ۱۳۰۶۔ ۱۳۰۷۔ ۱۳۰۸۔ ۱۳۰۹۔ ۱۳۱۰۔ ۱۳۱۱۔ ۱۳۱۲۔ ۱۳۱۳۔ ۱۳۱۴۔ ۱۳۱۵۔ ۱۳۱۶۔ ۱۳۱۷۔ ۱۳۱۸۔ ۱۳۱۹۔ ۱۳۲۰۔ ۱۳۲۱۔ ۱۳۲۲۔ ۱۳۲۳۔ ۱۳۲۴۔ ۱۳۲۵۔ ۱۳۲۶۔ ۱۳۲۷۔ ۱۳۲۸۔ ۱۳۲۹۔ ۱۳۳۰۔ ۱۳۳۱۔ ۱۳۳۲۔ ۱۳۳۳۔ ۱۳۳۴۔ ۱۳۳۵۔ ۱۳۳۶۔ ۱۳۳۷۔ ۱۳۳۸۔ ۱۳۳۹۔ ۱۳۴۰۔ ۱۳۴۱۔ ۱۳۴۲۔ ۱۳۴۳۔ ۱۳۴۴۔ ۱۳۴۵۔ ۱۳۴۶۔ ۱۳۴۷۔ ۱۳۴۸۔ ۱۳۴۹۔ ۱۳۵۰۔ ۱۳۵۱۔ ۱۳۵۲۔ ۱۳۵۳۔ ۱۳۵۴۔ ۱۳۵۵۔ ۱۳۵۶۔ ۱۳۵۷۔ ۱۳۵۸۔ ۱۳۵۹۔ ۱۳۶۰۔ ۱۳۶۱۔ ۱۳۶۲۔ ۱۳۶۳۔ ۱۳۶۴۔ ۱۳۶۵۔ ۱۳۶۶۔ ۱۳۶۷۔ ۱۳۶۸۔ ۱۳۶۹۔ ۱۳۷۰۔ ۱۳۷۱۔ ۱۳۷۲۔ ۱۳۷۳۔ ۱۳۷۴۔ ۱۳۷۵۔ ۱۳۷۶۔ ۱۳۷۷۔ ۱۳۷۸۔ ۱۳۷۹۔ ۱۳۸۰۔ ۱۳۸۱۔ ۱۳

اور تجھ ساحسں کہاں سے لائیں      حسرت دل کی دلوں سے پائیں  
کس کے ہاتھوں سے غم دل کھائیں      ہم کہاں قسمت آزمائے جائیں  
تو ہی جب خنجر آزمائے ہوا

سخن تلخ کب ہے ان کے قریب      ان سے باتیں سننے یہ کس کے نصیب  
ہے ملاوت ہی کچھ سخن میں عجیب      کتنے شیریں ہیں تیرے لب کر قریب  
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

جب ہیں دھن تھی انکے لانے کی      استطاعت تھی گھر سجانے کی  
اب جو بدلی ہوا زمانے کی      ہے خبر گرم ان کے آنے کی  
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

جان طاعت ہی میں کھپائی تھی      کچھ خودی تھی نہ خود نمائی تھی  
سر تھا سہمہ تھا جہ سائی تھی      کیا وہ نمود کی خدائی تھی  
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

قابل فخر کیا ہے بات اپنی      عین احسان ہے اسکی خوشنودی  
ہم نے اس پر نثار کیا شے کی      جان دی، دی ہوئی اسی کی مٹی  
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غم سے خالی نہ کوئی دم گذرا      کیا ٹھکانہ ہے کم نصیبی کا  
کچھ نہ کچھ سلسلہ لگا ہی رہا      زخم گر دب گیا ابھرنے کا



کام گرگز گیا روا نہ ہوا  
 دعویٰ دوستی زبانی ہے دل میں تو دشمنی کی ٹھانی ہے  
 قہر ہے یا یہ جہر بانی ہے رہزنی ہے کہ دل ستانی ہے  
 لے کے دل دلستاں روانہ ہوا  
 مثل مرزا مہر وہ رہتے ہیں جی میں گھٹ گھٹ کے پھوٹتے ہیں  
 سب غم انتظار رہتے ہیں کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں  
 آج عنالرب غزل سرائے ہوا

یہی ہمیشہ نشیمن رہا تمنا کا رہا ہے درد اسی میں تمام دنیا کا  
 مگر ہے اب اسے درکار پہن صحرا کا گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا  
 گہر میں موہوا اضطراب دریا کا  
 ترا خیال و تصور جو دل کو ہے محبوب اسی سے نامہ نویسی کا شغل ہے مرغوب  
 مجھے امید کرم اور تجھ سے ہو کیا خوب یہ جانتا ہوں کہ تو اور پانچ مکتوب  
 مگر ستم زدہ ہوں ذوق خامہ فرسا کا  
 نہ ہونگے گل روش روزگار اگر کو یہی پسے گا زیر قدم سبزہ زار اگر ہے یہی  
 لٹے گا دہر کا نقش و نگار اگر ہے یہی خانے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی  
 دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا  
 ہنسی کا خاک بلیقہ نہیں کسی گل کو کہیں یہ سیر و تماشا نہ رخ افزا ہو

جمن کا قصد ہے یا رو تو مجھ کو ساتھ نہ لو غم فراق میں تکلیف میرا غم نہ دو

مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

مثال آئینہ حیرت زدہ سراپا ہوں امید وار تجسلی روح افزا ہوں

رہیں شوق ہوں سترتا بپا تمنا ہوں ہنوز محرمی حسن کو ترستا ہوں

کر رہے ہر بن مو کام چشم بینا کا

اب اور کیسے کہ انداز اس ستم گر کے دم نظارہ طلب گار جسکے پس ہم سے

اشارہ جان کا ہوگا تو یہ بھی روٹ دینگے دل اسکو پہلے ہی ناز واداسے دے بیٹھے

ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا

مے سر رشک کا انداز سخت مشکل ہے کہ قطرہ قطرہ میں پوشیدہ بحرِ کامل ہے

حساب کا کوئی دعویٰ کئے تو باطل ہے نہ کہہ کہ گریہ بر انداز حسرتِ دل ہے

مری نگاہ میں ہے جمع خرچ دریا کا

ستم جو اسکے اٹھاتا ہوں لہرِ شاد آسند نہیں کسی سے طلب گارِ عدل داد آسند

نہ مجھ سے اس کو نہ مرزا سے غدا آسند فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد آسند

جفا میں اس کی ہے انداز کار فرما کا

اس نے جبِ خست پے رقعہ منازل باندھا چھیرے ناوہ مرے گھر کے مقابل باندھا

مے نے کھانچا سرفہ سرفہ سے کاٹا باندھا جب بتوقیب سفہ یار نے محل باندھا

تپش شوق نے ہر ذرہ اک دل باندھا  
قتل کر دیے میں عشوہ تھا بڑا دست راز  
بانی قتل کر شہر تھا انگہ تھی غماز  
دیکھ کر آئید جب ہو گئے قتال انداز  
اہل بنیش نے ہجرت کدہ شوخی ناز

جو ہر آئینہ کو طوطی بسمل باندھا

منہ ہی جس کا نہ کبھی عرض تمنائیں کھلا  
اس کو حیراں کے سوا اور یہاں کیا ملتا  
کام کچھ سہل نہیں تھا طلب مقصد کا  
یاس و امید نے یک عہدہ میلہ مانگا  
عجز ہمت نے ظلم دل سائل باندھا

اس بیباں میں ہیں حیراں دل غروں غالب  
مال ترابے جس میں دگرگوں غالب  
ہو گیا فکر مضامین جگرخوں غالب  
زہد سے تشنگی ذوق کے سفھوں غالب  
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

اگر میں صورت قطرہ دریا سے جدا ہوتا  
تو کیوں درویشِ فقر بحثِ نیست و کا ہوتا  
مگر ہاں نفی سے اثبات پیدا بر ملا ہوتا  
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا  
ڈر لویا مجھ کو ہونے نہ ہونے میں تو کیا ہوتا

دل بیمار تو فکر و فائیں گھل گیا اپنا  
جگر باقی رہا تھا اکو درِ عشق نے کھایا  
جھکا بارالم سے فرق یوں پہرہاں ٹھٹھا  
ہو اجب غم سے محسوس تو غم کیا سرکٹنے کا

دہوتا اگر بدراتن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

اسی کی یاد میں اٹھوں پہر دل تہلے تہلے ہے تصور اس کا مزارات دن دگود کا تہا ہے  
خیال اکا بھلا کب خاطر نکلیں سے جاتا ہے ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے  
وہ ہر اک بات کہنا کیوں ہوتا تو کیا ہوتا

۲۲

کب کوئی باعث خونباری شرکاں سمجھا کب کوئی علت آہ شرر افشاں سمجھا  
کوئی غم خوار نہ حال دل نالاں سمجھا وہ مری چین جبین سے غم پہناں سمجھا  
راز مکتوب بے ربطی عنوان سمجھا  
لوث دنیا سے مکر ہے ماسینہ ہنوز دل میں باقی ہے ابھی کلفت دیر نہ ہنوز  
خاک بھی شکل صفائی نظر آئی نہ ہنوز یک الف بیش نہیں صیقل آئینہ ہنوز  
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریاں سمجھا

حاشیہ گذشتہ صفحہ کا: جس تخلیق عالم نہیں ہوئی تھی تب ہی خدا موجود تھا اور اگر کائنات پیدا نہ ہوتی تب بھی خدا ضرور ہرگز موجود ہوتا۔ اگر میں پیدا نہ کیا جاتا تو میرا وجود بھی خدا کے وجود میں نہ غم ہوتا یعنی میری سستی ہی میری بربادی کا باعث ہوتی۔ ”میسری ہی تھی تھی۔“ اس شعر کی شرح خود غالب صاحب ماسٹر پڑھا ہے لالہ اشوک خاں صاحب اس طرح کی: پہلے یہ گھٹنا چاہیے کہ ”بے عیارت فلاد کے آئینے سے ہے وردِ جللی آئینوں میں جو مر کہاں اور انکو قتل کون کرتا ہے فلاد کی جس چیز کو قتل کر دے گا شہر ہے ایک لکچر ٹرنگی اسکو الف صیقل کہتے ہیں جب یہ مقدمہ معلوم ہوا تو اس میں شہوم کو سمجھئے معرہ۔ چاک کرتا ہوں میں جب کہ گریاں سمجھا“ یعنی ابتدائی سیرت سے مشتق جنون ہے رنگ کمال فن حاصل نہیں ہوا آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا اس ایک نیکر صیقل کی جو ہے مجھے چاک کی صورت الف کی ہی ہوتی ہے اور چاک حسب اثر جنوں میں سے ہے۔“

حزن و اندوہ میں ناچاری خاطر مت پوچھ      زلیست سے باعث پیناری خاطر مت پوچھ  
 حال دشواری و بیماری خاطر مت پوچھ      شرح اسباب گرفتاری خاطر مت پوچھ  
 اس قدر رنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

کب یہ منظور ہے وہ علوہ نما ہو سرِ بام      کب گوارا ہے کہ وہ رخ ہو نظر گاہ عوام  
 چاہتا ہوں رہے مستورہ شوخ خود کام      بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرم خرام  
 رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدہ حیراں سمجھا

چھیل کر غیر نے اس کو جو غضب ناک کیا      آگ ہو کر صفتِ شعلہ آتش بھڑکا  
 باعث طیش تو اعیار کا سفلہ پن تھا      تجس سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہو گا  
 بنضِ خس سے تیشِ شعلہ سوزاں سمجھا

قطع منزل کے لئے میں نے کمر تو باندھی      پر نقاہت نے اجازت پئے رفتار نہ دی  
 نوبت نہ آئی تھی دو ایک قدم چلنے کی      سفر عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی  
 ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

کوئی پہلو بھی تو بچنے کا نہیں تھا دم مرگ      نشتر آخر رگ جاں نے وہی کھایا دم مرگ  
 پیش آیا وہی تقدیر کا کھاد دم مرگ      تھا اگر یزداں مژدہ یار سے دل تادم مرگ  
 دفع پر کانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

یوں تو تم بھی اسے کہتے تھے جفا کارا سدا      پھر بھی مژدے تھا کیا تمہیں ہیشیا راسدا  
 کیوں ہوئے دیدہ و دانستہ گرفتار ااسدا      دل دیا جان کے کیوں اسکو وفادارا سدا

غلطی کی کرچو کا فر کو مسلمان سمجھا

۲۳

پھر مجھے یار کا در یاد آیا    اپنا پھوٹا ہوا سر یاد آیا  
پھر وہی خون جگر یاد آیا    پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا  
دل جگر تشنہ فر یاد آیا

تھا ترا بکیر عذاب جہاں سوز    لفظ رخصت تھا سناں دلہ روز  
پھر نصیبوں نے دکھایا یہ روز    دم یا تھا نہ قیامت نے ہنوز  
پھر ترا وقت سفر یاد آیا

جب ملا آنکھ پھر الی اپنی    نظرِ لطف کسی دن نہ ہوئی  
کی نہ اک روز تغافل میں کسی    سادگی ہائے تمنا یعنی  
پھر وہ نیرنگ نظر یاد آیا

کیوں نہ فر یاد مجھے ہو مشکل    آبلے منہ میں ہیں سینہ گستاخ  
میں کہاں آہ و فغاں کے قابل    عذر و اماندگی اے حسرتِ دل  
نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا

بستجو گر نہ تری کی جاتی    یہ مصیبت ہی نہ جھیلی جاتی  
جان کیوں مفت میں اپنی جاتی    زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا  
مانتا ہوں وہ جگہ ہے اچھی ہیں وہاں عیش کے سامان سبھی  
کیا کروں گا جو طبیعت نہ لگی کیسا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی  
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

اب کہاں ضعف سے یار لائے فغاں آہ کی تاب نہ تانوں کی توار  
جی نذر تا ہے جو ہلنی ہے زباں آہ وہ جسراتِ فریاد کہاں  
دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا

دل میں رہ رہ کے جو آتا ہے خیال کیا بلا دیکھئے لا تنبے خیال  
پھر مجھے غم میں پھنسا تا ہے خیال پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال  
دل گم گشتہ مگر یاد آیا

قدر مسکن کی ابھی جانی ہے یہی اس میں بھی پریشانی ہے  
یہ ہے بے مثل وہ لاشانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے  
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

خاک ابھی میں نے کہاں چھانی ہے دل دھڑکتا ہے پریشانی ہے  
فرط ہیبت سے جگر پانی ہے کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

۱۔ اسی مضمون کا ایک شعر تو میں نے بھی کہا ہے۔ جیس وحشت میں سوتے صراخوں؟ کم ہیں ایسے گھر کی  
ویرانی۔ اسی طرح کا ایک شعر قابلِ مطالعہ ہے۔

یاد آیا مجھے گھر دیکھ دشت دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا  
 قاتل اس کا ہے ہر افساں شاید کہ بدی کی ہے مکافات بھی بد  
 جرم ہوئے کو تھا مرزا سرزد میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد  
 سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۲۴

آپ کے ساتھ کوئی دشمن بے بیر بھی تھا  
 سست رفتار کوئی از رہ ترویر بھی تھا  
 دیر کرنے میں کوئی مائل تیر بھی تھا  
 ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا  
 آپ آتے تھے مگر کوئی عنایاں بھی تھا

تم نے جو کام کیا غیر مشیت نہ کیا  
 تھا مقدر جو مرے واسطے ہونا وہ ہوا  
 دوں جو تنہا نہیں الزام تو کہہ میری خطا  
 تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلا  
 اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا

شاہد حال ہے ہر چند مرا حال زبوں  
 سخت حیراں ہوں کہ کیوں کر تجھے آگاہ کروں  
 کچھ خبر بھی ہے کہ میں عاشق دیرینہ ہوں  
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں  
 کبھی فراق میں تیرے کوئی بچیر بھی تھا

مجھ سے کہتا ہے کہ تو کون ہے کیا بتلا دوں  
 عاشق زار ہوں کیا اسکے سوا بتلا دوں  
 نہ رہا ہوں جو تجھے یاد تو آ بتلا دوں  
 تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں



کبھی فراق میں تیرے کوئی فخر بھی تھا  
 حد سے گندی ہوئی تھی چارہ گروں کی بیداد  
 بھول کر بھی تو نہ لب پر کبھی لایا فریاد  
 دل پریشانیوں میں بھی تو رہا خرم و شاد  
 قید میں ہے تو ہے وحشی کو وہی زلف کی یا  
 ہاں کچھ اک رنج گرا نباری رنج بھی تھا  
 محفل یار میں اللہ سے اس کا غنا  
 حق تو یہ ہے کہ بڑے بول کا سہہ نیچ  
 خوش ہوں اس سے کہ اثر کچھ تو ہوا بھول کا  
 دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈ  
 ناز کرتا تھا ولے طالب تاثیر بھی تھا  
 وصل شیریں سے وہ گوہر نہ سکا شیریں کا  
 کر گیا کام تو ایسا کہ رہا نام صدا  
 کہتے ہیں سنگ تراشی کو جو آپ ادنیٰ کام  
 پیشے میں عیب نہیں رکھتے نہ فرما دکونا  
 ہم ہی اشفہ سروں میں وہ حواں میو بھی تھا  
 سینہ زانو سے جو اس نے نہ دبایا نہ سہی  
 خنجر تیز گلے پر نہ چلا یا نہ سہی  
 ہاتھ شمشیر کا بڑھ کر نہ لگایا نہ سہی  
 ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی  
 آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا  
 ہم پہ فائق جو سمجھتے تھے کبھی اپنا حق  
 ان کو یہ خفیہ نویسی کا ملا کیسا  
 ان کی تحریر کو کیوں مانے سرتا پاختی  
 پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے نکھر پڑا  
 آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا  
 رکھتے تھے دیدہ دیدار طلب شوق بے تا  
 پھر تو دیکھا تو مجھے دید کا یارا ہی نہ تھا

ہلوہ دیکھا بھی مگر دل کا ناراں نکلا ۔ بکلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہیں لب تشنہ تھری بھی تھا

دی جو تشبہ اسے ہر درخشاں سے کہی ۔ آگ غصے سے ہوا چہرے کی رنگت بدلی

اس کی تمثیل ہی گویا کوئی دنیا میں نہ تھی ۔ یوسف اس کو کہوں اور کچھ کہے خیر ہوئی

گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

انکساری سے تو جو چاہو وہ کہلو غالب ۔ تم پہ دیکھا نہیں مڑانے کسی کو غالب

کوئی دعوے سے ذرا آگے کہے تو غالب ۔ ریت کے تمعین استاد نہیں ہو غالب

کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۲۵

دنیا میں کہی کیا کوئی دل برد ہوا تھا ۔ بد کیش و جفا پیشہ و کافر نہ ہوا تھا

سفاک مگر تیرے برابر نہ ہوا تھا ۔ تو دوست کسی کا بھی ستم گرد ہوا تھا

اور وہ پہلے وہ ظلم جو مجھ پر نہ ہوا تھا

قدرت جو ملے اور حسینوں کو بنائے ۔ اس کا کوئی ہمتا ہونہ چاہا یہ خدا نے

پائی نہ تھی تکمیل ابھی نور و ضیائے ۔ چھوڑا مرغش کی طرح دستِ قضا نے

لے کر خشبِ اودھ مصنوعی پاند جسکو حکیم ابن عطا مشہور ابن مقفع نے ادویاتِ مرکب سے تیار کیا تھا وہ پاند چاہ

خشب سے نکلتا تھا اسکی روشنی زیادہ دو ٹوک جاتی تھی وہ اہل پاند کے برابر روش نہ تھا آخر کار کچھ عرصہ بعد شق

ہو گیا کارکنانِ قضا و قدر نے آفتاب بنا کر شروع کیا ابھی اسکی روشنی تیرے جس و جال کے برابر نہ ہوئی تھی کہ اسکا حال بگا

ماہ خشب کی طرح ہوا ۱۳۔

خوشید ہنوز اس کے برابر ہوا تھا

۱ کم درمیں سے نہیں کچھ اشک ہمارے آنسو نہ ہوئے ہوتے تو گوہر ہی بنتے

ہے مادہ تو ایک ہی ایجادیں ان کے توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ گوہر نہ ہوا تھا

درو سے عیاں خیر خو خوار کا عالم مست آنکھ مگر فتنہ بیدار کا عالم

ہو جس سے پیا حشر وہ رفتار کا عالم جب تنگ کہ نہ دیکھا تھا قدر کا عالم

میں معترف فتنہ فشر نہ ہوا تھا

قسمت یہ کہاں تھی کہ کبیدہ اسے دیکھوں آنکھوں سے طوں پاؤں خوشاں گئے لوں

برسوں سے تمنا تھی کروٹے تو مناؤں میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں

یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

لکھنے میں فرشتوں نے سمندر کو کیا خشک اک لمحہ قلم کو کبھی ہونے نہ دیا خشک

عامی ہوں میں ایسا کہ قدم رکھتے ہی خشک دریا، معامی تنگ آبی سے ہوا خشک

میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

کیا سوز نہاں پر کسی آتش کو تو تفصیل جو اس سے فائدہ تھے نہیں قابل تفصیل

۲ سینہ تقار در ہم و دینار کی زنبیل جاری تھی اسد داغ جگر سے مری تحصیل

اے مرزا غالب صاحب ایک خط میں خواجہ غلام غوث تجھ کو تحریر فرماتے ہیں: پروم شد! اخاص نہیں ہوا کرتے۔ یوں

سننا مجھے باور نہ آیا یہاں تک تو میں مورد عتاب نہیں ہو سکتا: اسی خط کے آغاز میں یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔

میں سادہ دل آزدگی یار سے خوش ہوں یعنی کافی شوق مکرر نہ ہوا تھا

## آتش کردہ جاگیر سمندر نہ ہوا تھا

۲۶

میں کب فدائے خجرت تل نہیں رہا      کب تیغ نازیار کا بسمل نہیں ہوا  
لیکن وہ مضطرب مجھے حاصل نہیں رہا      عوض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا  
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

دل میں بھرے ہیں لاکھ غم اس کے دیے ہوئے      پوچھو نہ مرگدشت کرب میں جیسے ہوئے  
آیا تھا میں بقا کا تہیتہ کئے ہوئے      جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لئے ہوئے  
ہوں شمع کشتہ درخور محفل نہیں رہا

دشمن تھے اس کے سامنے سپہن سپہر کہ میں      پھرتے تھے ہاتھ پر وہ لئے اپنا سر کہ میں  
اب غیر ہیں کہ جن سے پھر ہی بے نظر کہ میں      مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کہ میں  
شایان دست و بازوئے قابل نہیں رہا

یکساں گداز شاہ سے یاں ساز باز ہے      محمود غزنوی کے برابر یا زہے  
دل صاف ہے کسی سے نہیں احتراز ہے      بر روئے شمش جہت در آئینہ باز ہے

سلاہ مزاحیہ      مٹی بنی بنش حقیر کو کھٹے ہیں انہوں نے گرم کو میرے حال کی خبر نہیں اگر دیکھو تو ماحور  
میں دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا۔ کوئی دم ایسا نہیں کہ تجھ کو دم واپس کا خیال نہ ہو۔ ساتھ میں کا ہو چکا  
ہوں اب کہاں تک جیوں گا۔ غزل، رہائی فار کا اردو دس ہزار بیت کہ چکا اب کہاں تک کہوں گا۔ زندگی بڑی  
بھلی جس طرح بنی کاٹی اب فکر یہ ہے کہ دیکھئے موت کیسی ہوتی ہے اور بعد موت کیا پیش آئے ہے پھر کھٹے ہیں  
سے عمر بھر دیکھا کئے مرنے کی راہ نہ مرنے پھر دیکھئے دیکھ لائیں کیا۔ ۱۲

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

جب سے کھلا ہوا ہے تصویریں باب حسن      پیش نظر ہے آٹھ پہر آفتاب حسن  
اٹھا ہے درمیان سے گویا جاب حسن      واکر دیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

تھا صبح و شام درپے کس چرخ کج مدار      تھا غم سے وقف درد و غلش سینہ تھا فگار  
دل تھا ہزار کاوش حریاں سے بے قرار      گو میں رہا رہیں تم ہائے روزگار

لیکن ترے خیال سے بے فائل نہیں رہا

خوننا بہ جگر سے سدا مثل باغباں      ہم سینچتے رہے تین الفبت ہستاں  
دیکھا مال کو تو تردد تھا رائیگاں      دل سے ہوائے کشت و فضا گئی کواں

حاصل سوائے حسرت حاصل نہیں رہا

یہ تیغ آزمائے تو حاضر ہے سرا سدا      کھینچے یہ تیرا گر تو ہے سینہ سپر اسدا  
مرزا ہوں کھیل جاؤں گا میں جان پر اسدا      پیدا و عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدا

جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جس کو ہم سمجھتے تھے یا رہر ہاں اپنا      ہو گیا وہی دشمن آہ ناگہاں اپنا  
ہم نے اپنے ہاتھوں سے کر لیا زیاں اپنا      ذکر اس پری و ش کا اور پھر بیاں اپنا

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

ان کو قہری ہو سنا کی مے کشی میں اتنی کب پیتے تھے جو میرے ساتھ کرتے تھے حفظِ تر لب

ضد ہی کچھ مر مغل ان کو چڑھ گئی بیڈھب مئے وہ کبوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب

آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا

حال اضطرابِ دل کچھ اسے دکھا سکتے نار کے ذریعہ سے دکھ اسے سنا سکتے

لطف اس کے جلوے کا دم بدم اٹھا سکتے منظر اک بندری پر اور ہم بننا سکتے

عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکان اپنا

بستر اسکے کوچے میں اک طرف جمالیں گے جو کڑی پڑے گی اب شوق سے اٹھالیں گے

اب تو اس سے ملنے کی راہ کچھ نکالیں گے دے وہ جس قدر ذلت ہم بندہ میں ٹالیں گے

بارے آشنا نکلا ان کا پاس ہاں اپنا

دل میں ہے کرٹنے کی خود ہی ان سے ٹھہراؤں سلسلہ کتابت کا درمیاں سے اٹھواؤں

نامہ بر سے کیا ہو گا خود ہی ان کو کجھاؤں درِ دل لکھوں کب تک جاؤں انکو دکھاؤں

انگلیاں فکار اپنی خام خوں چکاں اپنا

ہو گیا ہوں جب عادی آستانے بھڑوں کا پھر بھی تو یہیں آخر ہوں گامیں جہیں فرسا

پلے بپے جرات اور دن بھر میں یہاں کرتا گھستے گھستے مٹ جاتا اپنے عبت بدلا

ننگِ بجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

لاکھ اس کی محفل میں غیر کی رسائی ہو اب کسی برائی میں لبِ ذرا ہلائے تو

اس کے منہ سے کھلایا ہم کو کہنا تھا جو جو تاکے دغا بازی کر یا ہے دشمن کو  
دوست کی شکایت میں ہم نے ہزیاں اپنا  
روز کے شانے سے کر دیا ہے تنگ اسے جسے اب تو اسے مرزا بڑھکے ستم اس کے  
کہتے ہیں عداوت ہے اسکو ہر زور سے ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے  
بلے سبب ہوا غالب دشمن آسمان اپنا

۲۸

ظلم پر وہ عذر و جھٹ لائیں کیا غیر تاویل غلط فرمائیں کیا  
چھوڑ کر ایذا دہی شرمائیں کیا جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا  
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا  
جو مقدر ہے وہ ہو گا بے گناں پھر ہوں کیوں مصروف سعی رائیگاں  
ہیں امیریں بھی جو قائم ہے جہاں رات دن گردش میں ہیں سات آسمان  
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۱۔ مرزا غالب ایک خط میں قائم علی تہر کو یور تقریر دلاتے ہیں "میں نے کتابیں چاہی ہیں بیسیل پارسل ارسال  
کیں اگرچہ پہنچنے کی خبر باقی ہے مگر قریب کیوں سے نہیں آئی حالات دن گردش آگے دیکھا بھائی اس غول کا مطلع  
کیا ہے ۲۔ جوڑے باز آئے پر باز آئیں کیا کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھائیں کیا ۳  
۴۔ مرزا غالب نے ایک خط نام مرزا ترم بیگ مصنف "سلاطین برہان" لکھا ہے جس سے مرزا صاحب کی دماغی صلاحیت  
طبیعت اور تحقیق کا پورا اظہار ہوتا ہے لکھتے ہیں "کہہ چکا ہوں کہ تجھ کو مناظرے کا دماغ نہ ہو جو امراض جسمانی و آلاء  
روحانی سے فراغ ہو بہت نہیں ہاری تھی اور غیب سے توقع مدد گاری تھی لہذا اپنا بیچارہ دل سے درد نہ بانہ اور اس  
(دماغی صدمہ پر)"





## کوئی بتلاؤ کہ ہم بت لائیں کیا

۲۹

شرط ہے اس کا ذرا جلوہ نما ہو جانا پھر تو آساں ہے مجھے مٹو لقا ہو جانا

راحتِ جزو نہیں کل سے جدا ہو جانا عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا

درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یا تو تھا محمد سے محبت میں کبھی عہد ابد اب ہے کس تفرقہ انداز کے باعث دو کہ

ہو گیا ایک ہی جنگی میں محبت کا رد تجربے قسمت میں مری صورتِ فعل، ابجد

تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

ہوتی تھی اس کے لئے فکر ہی صبح و شام نہ ہوئی واشدگی اور نہ ہوا کچھ آرام

بسکہ دریاں مخالف سے فنا تھا انجام دل ہوا کش مکش چارہ زہمت میں تمام

مٹ گیا گھسنے میں اس عقد کا واپس جانا

جب تک ہم سے تعلق تھا اور اک طرح کی راہ چھڑاٹھا یاد کے اور ظلم کے خواطر خواہ

دفعاً پھر گئے کیوں آپ بتائیں تو گناہ اس جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ

اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

خون اک آتش سیال مرے دلیں تھا پانی ہو کہ دم گریہ جو مژہ پر آیا

خاک بھی تن میں بجز عنصرِ خاکی نہ رہا نصف سے گریہ بدل بد دم سرزد ہوا

باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

جلوہ گران میں تصور سے تیری مثال      مردم چشم کا آنکھوں سے نکلنا ہے محال  
جی میں جو بات کھپتی دیکھے کس طرح نکال      دل سے مناتری انگشت خانی کا محال

ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

اپنی ہستی کو سر بزم جو کرتی ہے فنا      شمع نے مجھ سے دم گر یہ یہ گھلتا سیکھا  
بیچ کن ہے مرا گر یہ ہی مری ہستی کا      ہے مجھے ابر بہاری کا برس کر کھلتا  
روستہ دوتے غم وقت میں فنا ہو جانا

سبزہ رکھتا ہے ترے پاؤں کے بوسے کی ہوس      گل کو بازار میں لائی ترے جلوے کی ہوس  
تجھ تلک کس کو نہیں اٹکے پہنچنے کی ہوس      گر نہیں نگہت گل کو ترے کو بچے کی ہوس

کیوں ہے گردِ درو جو لانا صبا ہو جانا

جن کو رہتی ہے صفائی کی تمنا ہر پل      خواہش تصفیہ قلب میں وہ ہیں بیکل  
کر کے پہلے ہر رنگ میں شوقِ پناہ ل      تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل

دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

قابل دید ہے ہر ذرہ یہاں کا غالب      کیوں نہ پھر کھجے نظارہ دنیا غالب  
متفق تم سے ہے اس قول میں مرزا غالب      بخش ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

پھر گلوں کا باغ میں منظر کھلا      بہن سبز اور اراق کا دفتر کھلا  
یہ بہار اور ظلم یہ مجھ پر کھلا      کچ میں بیٹھا، ہوں، یوں پر کھلا  
کا شے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم ہیں اس دھن میں کہ وہ خود ہی بلائے      کون جا کر بے طلب خفت اٹھائے  
جائیں جاتے ہیں اگر اپنے پر اے      ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے  
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

ان کو ہے دشمن کی یاری پر گھمنڈ      دوستی پر جانثاری پر گھمنڈ  
اس کو اپنی ہوشیاری پر گھمنڈ      ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ  
دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

داغ کھا کر دل ہوا تھا باغ باغ      تھا معطر اس گل ترے داغ  
یہ اندھیرے گھر کا تھا روشن چراغ      واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ  
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

باز آیا ظلم سے کب وہ جواں      تاز سے اس کے ہے بسمل اک جہاں  
پھینک دی شرکاں نے کب اپنی ستاں      ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کہاں  
کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا

وودی جب پہر تاج ہے یہ گمراہ سا      پھر کسی کا خاک ہو گا رہنما  
یہ سنا ہے تو حرج کیا      مفت کا کس کو برا ہے بدرقمہ

رہرودی میں پردہ رہبر کھلا

کب تک برسا کرے بارانِ اشک      چارہ کس کس کا کرے بارانِ اشک  
کیا جگر ٹھنڈا کرے بارانِ اشک      سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک

آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

ہو گیا جامِ مسرت جامِ مرگ      حور کا بازو بنی مصمصِ مرگ  
نکلے صبحِ زندگانی شامِ مرگ      نامہ کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ

رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

اس سے بڑھ کر زند کیا ہو گا کوئی      ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کوئی  
اس کو کیا چھوٹے گا اسے مرزا کوئی      دیکھو غائب سے گرا لجھا کوئی  
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

ردیف (ب)

ہے مرے واسطے سامانِ بقا موجِ شراب      اس سے جیتا ہوں کہے روحِ فزا موجِ شراب  
لے حاشہ شیر

ایک مدت سے نہ تھی جلوہ نما موجِ شراب پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب  
دے بٹے کوئل دوستِ شاموچِ شراب

بزمِ رندانِ قدحِ خوار بنابے گلشن بادہ نوشوں کی طرح جھوٹے ہیں سرو و سن  
نیچو دوست ہیں مرغانِ گلستانِ ہر تن پوچھ مت و جہر سیہ مستیِ اربابِ چمن  
سایہ تک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

بے حسے مل گئی شاہانہ دلخ اس کا ہے تخت شاہی کی پھر اس مست کو پڑا کیا ہے  
کون ہو اس کا شنوار یہ عجب دریائے جو ہوا غرقِ مے بختِ رسار کھتا ہے  
سرے گزے پر بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

خشک اشجار کو بھی اس نے کیا بار آور دور کیا ہے کہ لگیں سرو چرغاں میں ثمر  
ہوتی ہے اس کی ہوا بھی عجب اعجاز اثر ہے یہ برسات وہ مہموم کہ عجب کیا ہو اگر  
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

بقضہ - مراعات سے اپنے ولی ہونے کے معلق اپنی ایک غزل کے مقطع میں بھی کہا ہے -

یہ مسائل تصوف تیرا بیان غالب تجھے ہم ولی بکھتے جو نہ خوار ہوتا

دیکھنے والوں پر کیا شوخیاد انداز اختیار کیا ہے اور میں غالب صاحب کسی ولی سے کم نہ  
تھے جس کا پتہ ان کے اشعار کے الہامی کیفیت سے چلتا ہے - ۱۲

۱۵ ایران میں قاعدہ ہے کہ جبہ انور یک جلتہ ہی تو سنگِ درم کے حوضوں میں بھر دیے جاتے ہیں، آفتاب کی تیزی  
سے دو چار دن بعد ان کا عرق نکلتا شروع ہوتا ہے اس وقت دھڑلے کے ان حوضوں میں انکرنگٹوروں کو پاؤں سے  
رغندے ہیں اس کے بعد ٹہنی کی بند مہر مایاں حوضوں میں ڈال دی جاتی ہیں انہی مراحموں کو بٹے کہتے ہیں - ۱۲

موسم گلے گلستاں میں کیا کیا جادو پھولے پڑتے ہیں مسرت سے گلنداں رو  
 موج میں پھرتی ہے مستانہ گلوں کی خوشبو چار موج اٹھتی ہیں طوفان ہوا سے ہر سو  
 موجِ گل موجِ شفقِ موجِ صبا موجِ شراب

مے کدیں جوشِ روز میں سرگرم نیاز ان سے پوچھے کوئی شادابی گلزار کا راز  
 ہے یہ ہاراں کی کرامت نہ ہوا کا اعجاز جس قدر روح بناتی ہے بجز نشہ ناز

دسے تسکین بدِ آبِ بقا موجِ شراب  
 اپنی حرمت میں یہ نکلی گل تر سے برتر رنگ پر اس کے فدا دل پر تو صدقے ہو جگر  
 قوتِ نامیہ نام اس کا نہ ہو اس کا اثر بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر  
 شہرِ رنگ سے ہے بالکشا موجِ شراب

جامِ جمشید کا ہمسرہ مرا جامِ سفال سامنے ہیں مری نظروں کے جہاں کے احوال  
 کیوں نہ چل ہومری فکرِ درخشاں کو کمال موجِ گل سے چراغاں ہے گزر گاہِ خیال  
 ہے تصویر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

آنکھ مٹاتی ہے چڑھتی ہے بالائے دماغ موجِ زن دلیں ہے ہر وقت تنائے دماغ  
 ہے جو مرغوب اسے منزلِ زیبا ہے دماغ نشر کے پردے میں ہے خود تماشائے دماغ  
 بسکہ رکھتی ہے بر نشو و نما موجِ شراب

ہے عجب عالمِ نورانی کیفیت فصل کیفیت کوئی نہیں ثانی کیفیت فصل  
 کیونے کیوں نہ شاخوانی کیفیت فصل ایک عالم پر ہے طوفانی کیفیت فصل

موجِ بہرہ نونیز سے تاجِ شراب

جس کو اس بزم میں ساقی نے دیا ساغرِ دل اس کے سر میں نہرا وہم و خیالِ جزو کل  
شارحِ فصلِ گلستاں ہے نوائے بلبل شرحِ ہنگامہ ہستی ہے زہے موسمِ گل

رہبرِ قطرہ بہ دریا ہے خوشاموجِ شراب

شوقِ بادہِ دلِ مرزا میں بھرا پھر بند بعد تو بہ کے کہیں پھر نہ خطا ہو سرزد  
فصلِ گلِ جوش پہ ہے ابر کی بھی بے آند ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد  
پھر ہوا وقت کہ ہو بالکشا موجِ شراب

## ردیف (ت)

۳۲

خار زارِ اتو ہوا ہے گلشنِ بے خارِ دوست ہے نمونے بہرہ سے صرف خزاں گلزارِ دوست

چھپ گئی ہے تیرگی میں تابشِ انوارِ دوست آمد خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست  
دو در شمع کشتہ ہے شاید خطِ خسارِ دوست

آنکھ اٹھائے اس کے نظارہ کو ہر کس کا جگر کیا لڑا سکتا ہے کوئی برقِ تاباں نظر  
لن ترانی اس کو زیاہے کمالِ حسن پر اسے دلِ ناعاقبت اندیش غبطِ شوق کر  
کون لا سکتا ہے تابِ جلوہ دیدارِ دوست

لے حاشیہ ۱۵ پر

سانے ہو کر مس گزرا کچھ اس انداز سے ہر قدم پر پائمالی کے مزے میں لگنے  
 کر دیا سرتا پاک ویدہ حیران مجھے خانہ ویران، سازی حیرت تماشا کیجئے  
 صورت نقش قدم ہوں زخم زخماں دوست

غیر کے ساتھ ان کو دیکھوں کہاں یا راجھے پوچھئے آئے تو دکھلایا یہ نظار اجمے  
 کچھ نظر آیا نہ مرنے کے سوا چار اجمے عشق میں بیدار شک غیر نے مارا مجھے  
 کشتہ دشمن ہوں مگر گرہ تھا بیمار دوست

ہو اگر ہر آن ہم پر اک نئی افتاد ہے اپنا لب کب آشنائے شکوہ بیدار ہے  
 خوش ہے وہ زاری سے اور لذت کش فریاد ہے چشم مارو شن کہ اس بیدار کا دل شاد ہے  
 دیدہ پر خوں ہمارا ساغر نثار دوست

قطع

۱۰۵۶



یہ رفاقت کی جو ٹھہرائی ہے اس نے بحر میں جا ہتا کر دیے دھوکا بھید کچھ لے بحر میں  
 اس پہلے سے غم وایز اجمے دے بحر میں غیروں کو تباہ کشتی سے اس کے بحر میں  
 ہاں تکلف دوست مجھ سے کوئی تمنا پر دوست

اوحایہ ہے کہ ہیں تابع مرے جن و ملک نہر و مہر و پری و آدمی و ارض و فلک

حاشیہ ص ۱۰۵۔ مامترع میں میرے احباب محبوب کو اس وقت میرے پاس لائے جب میں ان کے انتظار میں بار بار اٹھتا ہوں  
 کھولنے کا کوشش کر رہا تھا مگر اس انتظار میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں اور میں اسے دیکھ بھی نہ سکا حیرت  
 کی انتہا ہے اس مضمون کا ایک شعر حضرت غالب صاحب نے ادا بھی کیا ہے  
 منہ نہیں کھولتے کا کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس ماضی پر اڑ کے پاسی ۲



یوں بیاں کرتا ہے اس مغل کی باتیں حیرت  
تا کہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک

مجھ کو دیتا ہے پیام وعدہ دیدار دوست

میرے ہر اک درد کا ظالم لگا تا ہے سراغ  
اور یہ کہتا ہے کہ اب حاصل ہوا اس سے فراغ

کیا بتاؤں مجھ کو دکھلاتا ہے کیا کیا ہمزباغ  
جب کہ میں کرتا ہوں اپنا شکوہ ضعف دماغ

مگر کہ ہر وہ حدیث لطفِ غنیمتِ یار دوست

باتوں باتوں میں لگا دیتا ہے دل میں نیتنر  
یاد دلواتا ہے باتیں یار کی آنکھوں پہر

ہے تسلی و دلاسا سے جفا مد نظر  
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر

ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست

دشمن اس کا مرسلہ آیا ستانے کے لئے  
دوست بن کر ظلم اس انداز سے اسنے کئے

ہوں تخریب کہ دونوں میں کہ دکھ کس دئے  
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے

یا بیاں کیجئے سپاس لذتِ آزار دوست

بات جو ہوتی ہر اچھی دلیس کھپ جاتی ہر آپ  
کھینچ کر سامع کا دل اپنی طرف لاتی ہر آپ

طبع مرزا دمدم یہ کہکراتر آتی ہے آپ  
یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ

ہر دلیف شعریں فالتی بس تکرار دوست

## ردیف (دو)

(۳۳)

ناز کا لطف حسینوں سے گیا میرے بعد      دلربا عشوہ دل کش نہ رہا میرے بعد  
وہ کرشمہ نہ رہا ہو شرابا میرے بعد      حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

شیوہ غنچ و دلال آج جہاں سے اٹھا      کام سے اپنے ہوا ناز معطل گویا  
اب کہاں ہو کوئی دل ان سے جو ہو عہد برا      منصب شفقتی کے کوئی قابل نہ رہا

ہوئی معزولی انداز وادامیرے بعد

اب کہاں ہے کوئی سر باز بیسرمجھ سا      تیر جس کے لئے کی جائے گی شمشیر قضا  
اب تو بیکار ہے خود جو ہر ذاتی اس کا      درخو رخص نہیں جو ہر بیدا کو جا

نگہ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

یا کبھی ان کی پھر انگشت ابھیں تر تھی      یا نظر آتی تھی پوروں پر خنکی سرخی  
میرے مرتے ہی صدا فسوس یہ نوبت پہنچی      خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی

ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حایمے بعد

آج دنیا سے اٹھی درمت گریہاں کی نزار      اب کبھی ایک جگہ ان کا نہ ہوگا اجراع

رہنِ عشق سے محفوظ ہوئی دلی متاع ہے جنوں اہل جنوں کیلئے اغوش و دراع

چاک ہوتا ہے گریہاں سے جدا کیے بعد

کے کرے بند ہوئے سرد ہوا گلخنِ عشق کون ایسا ہے کہ آباد کرے گلخنِ عشق

ہے کوئی اب کہ ہوا سوارِ بر تو سنِ عشق کون ہوتا ہے حریفِ نئے مردِ فگنِ عشق

ہے مگر رب ساقی پہ صلا میرے بعد

بزمِ الفت ہے دھواںِ حار تو جیت گیا ہے کیا تعجب ہے جو اندھیر بہاں چھایا ہے

مجھ سا پروانہ جاں سوز کہاں پیدا ہے شمعِ جمعیتی تو اس میں سے دھواںِ شعلے

شعلہٴ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

مذوں روئگی سر پیٹ کے حسرتِ میری کوئی بھی بات نہ پوچھے گاتمناؤں کی

بے کسی ہوگی پس مرگ لی پر چھائی غم سے قربا ہوں کہ اتنا نہیں نیاسیں کوئی

کہ کرے تعزیتِ جہر و وفا میرے بعد

چھوٹ کر مجھ سے ہوا ایکس و تنہا غالب ایسا وارفتہ کہاں اس کو طے گا غالب

ہاتھ ملتا ہے جو افسوس سے مرزا غالب آئے بے کسی عشق پر رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلائیے بعد

۱۔ حوالہ گنِ عشق۔ مرد کو پھاڑ دینے والی عشق کی شراب

میرے مراد کے بعد ساقی پکا پکا کر کہہ رہا ہے کہ اب کوئی ہے جو مردِ فگنِ عشق کا حریف ہو یعنی عشق کی شراب کا

جام ہے۔ لیکن جب کوئی آواز نہیں آتی تو پھر چپکے سے یلوس ہو کر کہتا ہے کہ حریفِ نئے مردِ فگنِ عشق کون ہو سکتا ہے

یعنی کوئی بھی نہیں ہو سکتا۔ اس شعر میں نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا

(دلی ص ۷۷ پر)

## رولیف ( ر )

۳۴

ہوئے ہیں سدرہ شوقِ در در دیوار      د اس کو روک سکیں گے مگر در دیوار  
کریں گے اور اسے تیز تر در دیوار      بلا سے ہیں جو یہ پیش نظر در دیوار

نگاہ شوق کو ہیں بال و پیر در دیوار

شبِ فراق میں رونے کی آگئی جو امنگ      تو پل کی پل میں ہوا کچھ عجیب گھر کا ڈھنگ  
ادھر ہے خشت کا انہار اُدھر ہو تو وہ سنگ      و فورِ اشک نے کا شاد کا کیا یہ رنگ

کہ ہو گئے مرنے دیوار و در در دیوار

خبر ہے کہ سرِ شام آئی گاؤں نگار      تو سایہ حد سے بڑھتا کہ ہو قدم پہ نثار  
چلا ہی جلتا ہے بڑھتا ہوا نہیں ہے قرار      نہیں ہے سایہ کہ سنکر نویدِ مقدم یار

گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

چڑھا دماغ میں کچھ نشہ شباب ایسا      کہ گرم کر دیا بازارِ خود نمائی کا

بقیہ ۱۵۵ء - کے الفاظ ہیں۔ اس مصرع کو مکرر پڑھ رہا ہے ایک دفعہ بلانے کے بعد میں پڑھا ہے کون ہوتا ہے عزت  
سے مردانگ عشق، یعنی کوئی ہے جو ہے مردانگ عشق کا حریف ہو پھر جب کوئی آواز پر نہیں آتا تو اسی مصرع  
کو مایوسی کے بعد میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف..... یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ  
اور طرزِ ادا کو بہت دخل ہے کہ کو بلانے کا لہجہ اور بے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے اس طرح مصرع  
مذکورہ کی تکرار کرنے سے یہ معنی نکلنا نہیں ہو جائیں گے۔

کسی سے اب تجھے مطلق حجاب بھی نہ ہا      ہوئی ہے اس قدر ارزانی سے جلوہ  
کرمست ہے تمہے کو چے میں ہر در و دیوار

سدا جو جانب دیوار و در رہا نکلتا      ہوا ہے آئینہ ہر سنگ و خشت حیرت کا  
کئے ہیں کام مری چشم شوق نے کیا کیا      جو ہے تجھے سر سودائے انتظار تو آ  
کہ ہیں دکان متاعِ نظر در و دیوار

رہی ہمیشہ جو گردش ہی سایہ کو گھر کے      یہ شوق تھا کہ بلائیں یہ اس کے گھر کی لے  
نصیبِ خفتہ مرے غم کدہ کے جاگ اٹھے      وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے

ہوئے فل در و دیوار پر در و دیوار  
یہ آرزو ہے کہ اپنوں سے پائیں آزادی      یہ رونق ان کی نہیں ہم کو وہ نشادی  
چہل پہل سے پریشان ہیں ل سے فریادی      نظریں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی

ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار  
ہمیشہ ضبط ہی گریہ کو کر لیا میں نے      اُنہ کے اشک جو اُنہ انھیں پیامیں نے  
یہ عجز دیکھ کے گھر کو بچا دیا میں نے      نجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے  
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

ہر ایک جزو ہے گھر کا سرور سے بیتاب      ہر ایک ذرہ نظر آ رہا ہے مست و خراب  
ہمارے اشک نے گویا اٹھادیئے ہیں حجاب      نہ پوچھ بے خودی عیشِ مقدم سیلاب  
کہ نہ چتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نہ کوئی دوست ہے مزا کہیں نہ ملے میں      نہ راز داں ہے نہ ہے ہمیشیں نہ ملے میں  
 بھرے ہوئے ہیں بہت اہل کیں نہ ملے میں      نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں نہ ملے میں  
 حریف رازِ محبت مگر درو دیوار

۳۵

پایا نہ میرے گھر کو ستم گر کہے بغیر      ڈھونڈا ہے گھر رقیب کا کیونکر کہے بغیر  
 سمجھا مرا پستہ نہ مکر کہے بغیر      گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر  
 جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

جب تک وہ دیکھتے تھے کہے قدرت سخن      اک روز بھی تو مجھ کو نہ دی رخصت سخن  
 چھوڑا کبھی تو بولے نہیں فرصت سخن      کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن  
 جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

حراما نصیب کون ہے ہمساجان میں      نکلا نہ کوئی کام ہمسارا جہان میں  
 کس طرح دیکھے ہو گزرا جہان میں      کام اس سے اڑا ہے کہ جس کا جہان میں  
 یوں نہ کوئی نام ستم گر کہے بغیر

کیا کیا تمہارے ہاتھ سے ہوتے نہیں ستم      کیا کیا ہمیں پہنچتے نہیں تم سوز و غم  
 لیکن جو سودرا بھی شکایت تو لو قسم      جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے و گرنہ ہم  
 سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

ابرو کو اس کی کہتے ہیں شمشیر خوش نیام      تیرا جل ہے اس نگہ جاں ستاں کا نام  
ہوتا ہے ہر اداسکے بیاں میں اک انتظام      مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگوں کا کام  
چلتا نہیں ہے دشمنہ و خنجر کہے بغیر

بہتر سمجھتا ہے کوئی پتھر کو پوجنا      مذہب کسی کا مہر منور کو پوجنا  
ایمان عاشقوں کا ہے دلبر کو پوجنا      چھوڑوں گامیں نہ اس بتِ کافر کو پوجنا  
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

ہوتا نہ کس طرح سے فدائے خم و سبو      دکھلا رہا تھا عالم مستی مقام ہو  
پیش نظر خدا ہو جو ساقی ہو روبرو      ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو  
بنتی نہیں ہے شبشہ و ساغر کہے بغیر

رکھنا ہوں پاس اسلئے کاغذِ ظلم و دُش      تحریر سے ہوتا بسہولت ہر ایک بات  
ممکن ہے کون دن کہے سمجھوں یلکا کورت      بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہوا التفات  
سننا نہیں ہوں بات مکر کہے بغیر

مرزا نے کچھ کیا جو کبھی حالِ زار عرض      انجام یہ ہوا کہ ہوئی ناگوار عرض  
یوں ہی نہ ہو کہیں دلِ نازکِ بار عرض      غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض  
ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

اس بام پر تجسلی انوار دیکھ کر حیراں ہوں اپنے آپ کو ہشیار دیکھ کر  
 جھپکی نہ آنکھ برقی شرر بار دیکھ کر کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھ کر  
 جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھ کر

رکھتی ہے رات دن پیشِ دل تپاں مجھے تاب سکوں ہے برقی کی صورت کہاں مجھے  
 کرنا نہ آیا سوزِ محبت نہاں مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے  
 سرگرم نالہاں شرر بار دیکھ کر

ظلم و ستم کا وقت ہے کوئی نہ جو رکا اک کھیل ہو گیا کہ جب اٹھے ستالیا  
 دل اب تو نام سے ہے محبت کے کانپنا کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا  
 دکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

نوبت نہ آئی تھی کہ گلے پر مرے چلے چلنے سے اس کے پہلے ہی مرنا پڑا مجھے  
 یہ اور بوسے لے مرے قاتل کے ہاتھ سے آتے میرے قتل کو پر جوش رشک سے  
 مرنے والوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

مستی نے تیری کھو دیا صبر و سکونِ خلق ہے لغزشِ خرام سے زخمی دروِ غلطی

۱۔ آتشِ پرست۔ پارسی لوگ آگ کو مظہرِ خدا سمجھ کر پرستش کرتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں میں ہر وقت  
 آگ روشن رہتی ہے۔ فرماتے ہیں محبوب کی جہاں میں آہ و بکا کرتا ہوں اور میرے منہ سے آگ برساتے  
 والے ملے نکلے ہیں تو ان کو دیکھ کر لوگ مجھے آتشِ پرست کہتے ہیں۔ ۴



شیشہ ہوا ہے باعثِ حالِ زبونِ خلق      ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پر خونِ خلق  
لڑے ہے موج نے تری رفتار دیکھ کر

پڑتا ہے دمِ دم میں سروِ ہلالم سے ہاتھ      مصروفِ سینہ کو بی ہے ہر وقت غم سے ہاتھ  
قسمت کہاں وہ ہنس کے ملا کر گم ہاتھ      وحسرتا کر یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ  
مجھ کو حریص لذتِ آزار دیکھ کر

مضموں ہمارے تلے ہیں لعلِ بین کیساتھ      نسبت ہے حرفِ حرف کو درِ عدن کیساتھ  
لیتا ہے اس کو کوئی اگر تھرفن کے ساتھ      بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کیساتھ  
لیکن عیارِ طبع خریدار دیکھ کر

چلنے سے پیشتر تجھے لازم ہو دیکھ بھال      رستے کی اونچ نیچ سے چلنا نہ ہوا بال

لے متاعِ سخن      ظلام کی دولت، ہم ایسے متاعِ سخن کے خریدار کے ہاتھ بک جاتے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ سخن ہم اور  
سخن شاس ہو۔ غالب کی سلسلے میں منشی ہر گویا لائق کو ایک فارسی خط میں منشی نبی بخش حقیر کی سخن فہمی کے معنی لکھتے  
ہیں، یہ خط کتنا حسرت آمیز خدائے میری یکسی اور نہائی پر رحم کیا اور ایک شخص کو میرے پاس بھیجا جو میرے  
رفقوں کا درہم اور میرے درد کا درماں اپنے ساتھ لایا جس نے میری اندھیری راتوں کو روشن کر دیا۔ اس نے اپنی  
باتوں سے ایسی شمع روشن کی جس کی روشنی میں میں نے اپنے کلام کی خوبی و برتری و خوبی کے اندھیرے میں خود میری  
نگاہ سے نفعی تھی دیکھی میں حیران ہوں کہ اس فرزندِ یگانہ منسی نبی بخش کو کس درجہ سخن فہمی اور سخن سنجی عنایہ  
ہوئی ہے، حالانکہ شعر میں کہتا ہوں اور شعر کہا بھی جانتا ہوں مگر جب تک میں نے اس بزرگوار کو نہیں دیکھا یہ نہیں  
سمجھا کہ سخن فہمی کیا چیز ہے اور سخن فہمی کس کو کہتے ہیں؟ مشہور ہے کہ خدائے حسن کے دو حصے کے آدھا یوسف  
کو دیا اور آدھا بنی نوع انسان کو۔ کچھ تعجب نہیں کہ ہم سخن و ذوقِ معنی کے بھی دو حصے کے گئے ہیں۔ آدھا منشی  
نبی بخش کے اور آدھا تمام دنیا کے صحیح میں آیا ہو۔ جو زمانہ اور آسمان میرے گہا ہی مخالف ہو مگر میں اس شخص کی  
بدولت رہنے کی دشمنی سے بے فکر ہیں اور اس نعمت و نیا پد کا نفع و (از یادگارِ فاضل)

پُرسنگ راہ میں بھی ہے غافل سفرِ مال      ز ناز باندہ سببِ صد دانہ توڑ ڈال  
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

دن رات خاک دشت کی یا چھانتا تھا میں      یا کچھ دنوں سے نقشِ قدم بن رہا تھا میں  
مثلِ شکستہ پا سرِ وادی پڑا تھا میں      ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں  
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

اس درجہ بظنی ہے خدا جانے کیوں اسے      ہر دم یہ وہم ہے کہ محبت ہے اور سے  
کہتا ہر ہنس کے مجھ کو ہری چگ اسی لئے      کیا بد گمان ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے  
طولی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

ہیبتِ بٹھائی ہوتی طلبِ نور پر      خاکِ سیہ بیٹاڑ ہوا کس قصور پر  
یہ گرمیاں یہ غیظ اور اک بے شعور پر      رگرنی غمی ہم پر برقی بجلی نہ طور پر  
دیتے ہیں بادہِ ظرفِ قرحِ خوار دیکھ کر

دیکھا جو آستانہ تو آنکھوں میں پھر گیا      مرنا کا صبح و شام وہ سجدوں کا مشغلا  
دھجے جو پھر لہو کے نظر آئے جا بجا      سر پہوڑنا وہ غالبِ آشفۃ مال کا  
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

یہ مگر غمی پر ناحق میری بربادی کے سماں ہے      فطول اتنا ترس آیا ہے اس گرمیاں ترساں پر

خلیت کی یہ کیوں نچڑائے مال پریشاں پر  
لڑتا ہے مہر اول زحمت مہر درخشاں پر  
میں ہوں وہ قطرہ شہم کہ ہوں خرابیاں پر

ہوئی گوشت کے ہاتھوں زلے بھر میں رسوائی  
ہوا بے ساز و سامانی پہ بھی سامانِ زیبائی  
سیہانہ میں جب آئے کہ بھگتیں قید تنہائی  
نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی

سفیدی دیدہ یعقوب کی پھرتی ہونداں پر

جنوں مانع ہوا استاد کا احسان ٹھانے سے  
فراغت پا چکا روز ازل پڑھنے پڑھانے سے  
رہا انکار عقل کل کو غیر لانا سے  
فنا تعلیم درس بے خودی ہوں اس زلے سے

کہ جنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستان

جگر میں غلش سرگز نہ رہتی نشتر غم سے  
یہ ایذا میں ہوتی جو بیاب جبر کے دم سے  
کوئی دم جان کو بہلت تو ہوتی درجیم سے  
فراغت کس قدر رستی مجھے تشویش مرہم سے

بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکلاں پر

ہر بے نقشہ عالم سے سن آباد کا نقشا  
وہاں بیٹھا ہر سکر روز اول سے سرے سے کا

۱۔ حضرت یعقوب حبیب یوسف سے نہایت محبت رکھتے تھے۔ اسلئے ان کے دو مرتبے بھائی ان سے بہت جلتے ایک  
ن سب جاتی ان کو شکار کے ہانے جنگل میں لے گئے۔ اور ان کو ایک کنوئیں میں ڈھکیل دیا۔ گھر آکر اپنے ماپ سے  
لہدیا کہ یوسف کو بھڑپا اٹھالے گیا۔ حضرت یعقوب بہت رنجیدہ ہوئے اور یوسف کی یاد میں روتے روتے اندھے  
ہو گئے۔ ادھر یوسف کو ایک قافلے کے لوگوں نے کنوئیں سے نکال کر عزیز مصر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عزیز مصر  
لہ بیوی رہی حضرت یوسف کے حس و جل پر عاشق ہو گئی تھیں کہ حضرت یوسف نے انکی کوئی بات نہیں مانی۔ آخر کا  
یوں ہو کر اور ان ہر لازم لگا کر گوزندوں میں ڈال دیا۔ اس تعزیر میں واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ قید میں بھی حضرت  
یوسف نے خانہ آرائی۔ چھوڑی حضرت یعقوب کی آنکھوں کی سفیدی زندوں کی دیواروں پر پھر پھر کر اسے آراستہ  
اری تھی یعنی جس کسی حالت میں بھی اپنی آرائش نہیں چھوڑتا۔

نالوں کے دھوئیں کچے شب تار میں نقشا      انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا  
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا      لوگوں کو ہے نور شید جہاں تاب کا دھوکا  
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اکٹا غ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین      پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم حسین  
 دیتے ہیں کہاں جھک شوب و ز کے غم چین      لیٹا نہ اگر دل تمھیں دیتا کوئی دم چین  
 کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

تھمتے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے      بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے  
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹھرتا ہے نالے      ہاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے اشعار کہتے تھے جو بہت اچھے تھے      سیکڑوں ایک لیک سے بہتر بہت اچھے  
 مرزا کے بھی اشعار ہیں اکثر بہت اچھے      ہیں اور بھی دنیا میں سمخو بہت اچھے  
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۵ مرزا غالب نے اس شعر کی سرخ چینوں کو بدل رکھی ہے "لیٹا نہ اگر دل" یہ بہت لطیف تقریر ہے لیٹا کو  
 رابطہ چین سے کرنا امر تو طے آہ و فغاں سے غرض میں تعقید معنوی اور لفظی دونوں مبعوس ہیں فارسی  
 میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز بلکہ فصیح اور بلج رحمتہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر  
 دل تمھیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیٹا۔ اگر نہ مرزا تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرتا ہے

نیز پوری غزل (اس شعر کو تھوڑا کر) مرزا غالب نے عالم علی قہر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں  
 اس غزل کے سات شعر اور ایک اور غزل اس بزم میں مجھے نہیں مٹی جائے۔ "نوار" علامی کو اپنی یادداشت  
 پر بھی مٹی۔ ۱۲

وقف جو یہاں مجھ کو ابھی تھا کوئی دن اور      تم کو بھی مناسب تھا مگر ہا کوئی دن اور  
تم نے نہ مرا ساتھ نہ ہا کوئی دن اور      لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور  
تہا گئے کیوں اب ہو تہا کوئی دن اور

در پر ترے اس خاص غرض سے ہو چیں سا      منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا  
ہے سخت اگر سنگ در اس کی نہیں پروا      مٹ جائے گا سرگرترا ہنجر نہ گھسے گا  
ہوں در پر ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

بگڑے ہوئے آثار ہیں کیا بات بناؤں      کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں  
اک بات ذرا سی ہے جو مانو تو بتاؤں      آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

دیرینہ محبت کا کیا پاس نہ تم نے      حیرت ہے کہ کس دل کو جدا ہونے ہو مجھ سے

لکھ غزل نہیں مرنے سے مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم  
جی راہی ملک بھا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے  
بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کوئی پذیرہ جینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا  
تھا جینی بنالیا، زین العابدین خاں خوش فکر ہونے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی  
اچانک موت کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدروز نوہ لکھا چھ نکہ اسی سال مونس اور تسکین بھی  
گزرے تھے اس لئے سالک نے یہ تاریخ بھی مٹی ہے

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر      ارم میں عارف و تسکین و مومن

نالوں کے دھوئیں کچے شب تا میں نقشا      انجم میں ہے آہ شرر افشاں کا تماشا  
 ہے شعلہ الفت سے زمانے میں اجالا      لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا  
 ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغ نہاں اور

دل باختہ کو کب ہے ترے سر کی قسم چین      پاتا ہے کہاں بستہ زنجیر الم چین  
 دیتے ہیں کہاں مجھ کو شب و ز کے غم چین      لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین  
 کرتا جو نہ مرنے کوئی دن آہ و فغاں اور

تھے نہیں رستہ جو ذرا پاتے ہیں نالے      بہتے ہوئے اشکوں کے چلے آتے ہیں نالے  
 وہ جوش ہے دریا کو بھی ٹرتا ہے نالے      پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے  
 رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

پہلے شعرا کہتے تھے جو ہر بہت اچھے      تھے سیکڑوں ایک ایک سے بہتر بہت اچھے  
 مرزا کے بھی اشعار میں اکثر بہت اچھے      ہیں اور بھی دنیا میں سنغور بہت اچھے  
 کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۔ مرزا غالب نے اس شعری سربِ جنید کو یاد رکھی ہے "لیتا نہ اگر دل الایہ بہت لطیف تقریر ہے لیتا کو  
 رابطہ ہے چین سے مکرنا مربوط ہے آہ و فغاں سے مگر میں تعہید معنوی اور لفظی دونوں معسوب ہیں فارسی  
 میں تعہید معنوی عیب اور تعہید لفظی جائز بلکہ فصیح اور بلج ریختہ تقلید ہے فارسی کے حاصل معنی مصرعین ہر اگر  
 دل تمہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا نہ اگر نہ مرنے کوئی دن اور آہ و فغاں مکرنا ؟

نیز، پوری غزل (اس سحر کو چھوڑ کر) مرزا غالب نے حاتم علی قدیر کو ارسال فرمائی تھی علاوہ ازیں  
 اس غزل کے ساتھ شعر اور ایک اور غزل "اس بزم میں مجھے نہیں سی جایا" "نوارِ علائی کو تپ بادداشت  
 پر بھی تھی - ۱۲

مجبوراً بھی تھا کوئی دن اور تم کو بھی مناسب تھا ٹھہرنا کوئی دن اور  
 ساتھ نہ با کوئی دن اور لازم تھا کہ دیکھو مزارِ ستا کوئی دن اور  
 تنہا گئے کیوں اب ہو تنہا کوئی دن اور

خاص غرض سے ہوں جیں سا منظور ہے ہستی کا مجھے اپنی مٹانا  
 سنگِ در اس کی نہیں پروا مٹ جائے گا سرگزشتِ پتھر نہ گھسے گا  
 ہوں در پتھرے ناخیز سا کوئی دن اور

اے آثار ہیں کیا بات بناؤں کچھ روٹھ گئے ہو تو بتا دو کہ مناؤں  
 راسی ہے جو مانو تو بتاؤں آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں  
 مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

ت کا کیا پاس نہ تم نے حیرت ہے کہ کس لہر جہا ہوتے ہو مجھ سے

یہ مرثیہ مرزا غالب نے نواب زین العابدین عارف کی موت پر لکھا جو عین جوانی کے عالم  
 بنا ہوئے تھے جب کہ ان کی عمر ۲۶ برس کی تھی۔ غالب صاحب کے اپنے سات بچے ہوئے لڑکے  
 بھی مگر کوئی پندرہ چھینے سے زیادہ نہ جیا، لہذا زین العابدین خاں کو جو ان کی سالی کا لڑکا  
 با زین العابدین خاں خوش فکر ہوئے کی وجہ سے مرزا غالب کو اور بھی زیادہ عزیز تھے ان کی  
 کا مرزا غالب کو نہایت صدمہ ہوا۔ اور یہ دلدوز لڑکا چھ نکلے اسی سال موسیٰ اور تسکین بھی  
 لائے ساتھ نے یہ تاریخ بھی تھی

برس دن میں ہوئے یہ تین شاعر ارم میں عارف و تسکین و موسیٰ

باندھی ہے کمر ملک عدم کے ہیں ارادے جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے  
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن او

کس ذوق سے تھا نحو تماشا ابھی عارف اس نرم سے کس واسطے اٹھا ابھی عارف  
کیوں ہو گیا پیوند زمیں کا ابھی عارف کیوں اے فلک پر حواں نقا ابھی عارف  
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مڑتا کوئی دن اور

والہ تمہیں گھر کے اجالے کا سبب تھے چھایا ہے اک اندھیر مری آنکھوں کے آگے  
کس خاک کے پرے میں جیسے میری نظر سے تم ماہِ شب چار دم تھے مرے گھر کے  
پھر کپوں نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن او

مانا کہ وہ آیا تھا فقط جان ہی لینے ممکن تھا کہ جیلے سے اسے ٹالے رہتے  
کچھ بات بنا دیتے تو کیوں جھوٹے تم سے تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے  
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

جلدی جو یہ کی جانے میں کیا جی میں سمائی جاتے ہوئے ہر ایک سے کیوں آنکھ پھرائی  
افسوس نہ اپنوں کی بھی الفت تمہیں آئی مجھ سے تمہیں نفرت ہی تیرے لڑائی  
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

ناراض ہی تم تھے تو دلِ غمزدہ تھا خوش تم سامنے تو پہننے تھے ناخوش ہے یا خوش  
جب تم نہ ہے یہ تو کہو دل ہے کیا خوش گزری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش  
کرنا تھا جو انرگ گزرا کوئی دن اور



چھوڑے گی ابھی جان کہاں رشتہٴ قالب مرزا ابھی سمجھے نہیں تم اس کے مطالب  
کیا زیست ہر ایسے کی جو ہو موت کا طالب ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہیں غالب  
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن او

۲۰

اجابتوں پر دعاؤں کی کیجئے کیا ناز نہ عجز اپنا ہوا کارگر نہ سوز و گداز  
ازل میں بسکہ ہر اک شے کا ہو چکا ہر طراز حریفِ مطلب مشکل نہیں فسوں نیاز  
دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز

نظر ہی سب نہیں پھر دوڑ دھوپ ہے سود ابھی ہے تجھ سے بہت دور منزل مقصود  
ہر ایک ذرہ میں ہے نور ہستی معبود نہ ہو بہرہ بیاباں نور دویم وجود؟  
ہنوز تیرے تصور میں ہی نشیبِ فراز

ہم آج تک تو رہے شکلِ دیدہ حیراں ہوا نہ سامنے نظروں کے حسنِ یار عیاں  
گزاریں صبر میں کچھ اور دن کہاں یہ تو اں وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں  
کہ دیکھئے آئینہٴ انتظار کو پرواز

رہا ہے یہ تہہٴ تجر بھی ذوقِ دید میں مست گیلے جان سے پھر بھی ہوا خیالِ پست  
کیا ہے یا کے پرتو نے اسکو نیست و هست ہر ایک ذرہ عاشق ہے آفتاب پرست  
گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوہٴ ناز

عجب مقام میں مرزا ہے کیا کہوں غالب      مثال اسکو آگروں تو کس سے مومن غالب  
فضا میں عالم امکان ہے فزون غالب      نہ پوچھ وسعتِ میخانہ جنوں غالب  
جہاں یہ کائنات گروں پر ایک خاک انداز

۴۱

مفت ہوتے ہیں پریشان عزیز      کیا مجھے سمجھے ہیں نادان عزیز  
مجھ کو ہے یار کا فرمان عزیز      کیوں کر اس بت سے رکھوں جان عزیز  
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز  
مشکل اس کا ہے نکلا دل سے      ہے تعلق بھی بلا کا دل سے  
تیر کو تو نے جو کھینچا دل سے      دل سے نکلا یہ نہ نکلا دل سے  
ہے ترے تیر کا بہرکان عزیز  
آف نہ مرزا نے کبھی کی غالب      جو مصیبت پڑی جھیلی غالب  
ضبط لازم ہے تمہیں بھی غالب      تاب لاتے ہی بنے گی غالب  
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۵ مرزا غالب نے ایک خط میں مرزا آقہ کو لکھا کہ بکوں ترک لباس کرنے ہو، پینے کو نہ پائے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکو گے ترک لباس سے قہرِ ہستیاٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھانے پے گزارا نہ ہوگا۔ سختی اور سستی اور رخ و آرام کو ہوا کر دو جس صورت ہو اسکی صورت سے بہر صورت گزرنے دو۔ ج تا ب لاتے ۱۶۔ نیز نواب ملانی کو بھی لکھا ”بھائیوں سے پھر نہیں ملا۔ بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جو اہر خبردار میرا سلام انھیں کو ادا ان کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے اس کو غلیظت جانتا ہوں۔ ج تا ب لاتے ہی بنے گی غالب ۱۷۔“

میری ہستی ہے اک انوکھا راز      میں بستا و فنا ہم دم ساز  
ظاہر انجام ہے نہ کچھ آغاز      نہ نکل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز  
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تجھ کو ہنسنے سے کام صورت نکل      میں ہوں اور ہم نوائی بلبل  
لاگ دونوں میں آپری بالکل      تو اور آرائشِ خیم کا کل  
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

بس زیادہ نہ لے تعلق کی      غیر ممکن ہے دل کی آزادی  
کیا عجب ہے کھلے پر پردہ بھی      لاف تمکین فریبِ سادہ دلی  
ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گزار

جب سے کچھ قفس کیا آباد      بھول کر بھی نہیں چمن کی یاد  
دل نہیں چاہتا کہ ہوں آزاد      ہوں گرفتارِ الفتِ سیاد  
ورنہ باقی ہے طاقت پرواز

تنگ آیا ہوں بحرِ دلبر سے      کیوں نہ آنکھوں سے اشکِ خوں برسے  
دل کہاں تک فراق میں ترسے      وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گرسے  
ناز کہیںچوں بجائے حسرتِ ناز

یہ کوئی ضبط ہے کہ میں چپ ہوں      دل ہو خالی تو کیا لہو روؤں  
روتے روتے ہوا ہے حال زبوں      نہیں دل میں مرے وہ قطرہ خوں  
جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلہ باز

تیغِ بڑاں تری نگاہ تیسر      عشوہ تیرا جہاں سے گرم ستیز  
خوش خرامی تری قیامت فیز      اے ترا جلوہ یک قلم انگیز  
اے ترا ظلم سر بسر انداز

اٹھ گیا ہے نقابِ روئے نکو      خوب نکلیں گی حسرتیں اب تو  
منعِ پابوس سے نہ کر مجھ کو      تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو  
ریزشِ سجدہ جبینِ نیاز

غم سے کس دن میں جاں بلب نہ ہوا      ورد سے حالِ غیر کب نہ ہوا  
لطفِ مجھ پر یہ بے سبب نہ ہوا      مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا  
میں غریب اور تو غریب نواز

مروغش و مستِ نظم رہتا تھا      دل سے تنہا شاہدِ سخن پہندا  
روئے خاک اڑائے مرزا      اسد اللہ خاں تمام ہوا  
اے دریغا وہ زند شاہد باز

## روایف دک

(۴۳)

چاہتے یہ شوخ تو دنیا میں کیا کم تھا نمک      سنگ کے بدلے لے سکتے تھے پتھر کا نمک  
ان کے ہاتھوں کب دہان زخم نے چکھا نمک      زخم پر چھٹکس کہاں طفلانِ بے پروا نمک  
کیا مڑا ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

بے سبب کب تک سے اخترا زخمِ دل      تو نہیں واقف تو مجھ سے پوچھ از زخمِ دل  
اس کی خاکِ پاچھر گل لے چارہ ساز زخمِ دل      گھر در راہ یار ہے سامانِ ناز زخمِ دل  
ورنہ ہوتا بے جہاں میں کس قدر پیرا نمک

چاہتا ہوں میں تو یہ پیدا کوئی بید ہو      اور مرنے مجھ کو یہ ہے دیکھوں اسے ہنسنا ہو  
حسرتیں نکلیں کہیں فصلِ بہاری لائے تو      مجھ کو از رانی ہے تجھ کو مبارک ہو جو ہو  
نالہ بلبِل کا درد اور خندہ گل کا نمک

غیر ممکن تھا کسی مرہم سے ہوا اس کا علاج      تھا اسی دماں کا طالب اسکے زخموں کا مزاج  
تھی تنگ دو کس کی اس کو اور کس کی احتیاج      شورِ جولاں تھا کنارِ بحرِ بر کس کا کآج  
گردِ ساحل ہے بزخمِ موبہ دریا نمک

سیکھ لے اس شوخ سے کوئی محبت کا نباہ      گو بظاہر ہو چکی ہر مجھ سے ترکِ رسم و راہ

پھر بھی مجھ پر کس قدر ہے ہر بانی کی نگاہ داد دیتا ہے مرے زخم جگر کی واہ واہ

یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وجہ جانمک

پوچھ لو اگر یہ کیسی لگ رہی ہے انکوئے تاکہ ہو اس خستہ تن کا قصہ آسانی سے طے

تم گئے مجھ پر لگے ہونے تقاضے بے پرے چھوڑ کر جانا تن مجروح عاشق حیف ہے

دل طلبِ نابِ زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

ہے عروسے چارہ جوئی باعثِ تھقہ درد کیوں کسی کی سعی سے حاصل کروں تاثیر درد

اس کے ہنسنے سے مجھے ہاتھ آگئی نذرِ درد بغیر کی منت نہ کھینچوں گاپے تو قیر درد

زخمِ مثلِ خندہ قاتل ہے سزا پانمک

اپنی آنکھوں سے جو تیرے شوق کو پھر دیکھ لیں حضرت مرزا بھی تیری بخود کی داد دیں

اب کہاں وہ زخم کھائے اور کہاں وہ لذتیں یاد ہیں غالب مجھے وہ دن کو وھڑوق میں

زخم سے گرتا تو میں ہلکوں سے خستہ تھا نمک

۴۴

ختمِ قصہ ہے شبِ ہجر بسر ہونے تک صورتِ شمع ہوں مہمانِ سحر ہونے تک

کیا خبر حال ہو کیا تجھ کو خبر ہونے تک آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

اک تلامذہ ہر پاکیزہ ہے پھر دل تنگ روز طوفانِ حوادث کا ہر آمادہ جنگ

کس طرح دیکھئے بے چارہ کی نکلے گی ہنگ  
 دام ہر موج میں ہے حلقہ صد کام نہنگ  
 دیکھیں کیا گزرتے ہیں قطرہ پر گہر ہونے تک  
 آتش ہجر سے حالت ہے جگر کی جو خراب  
 کش مکش سے ہے مری جان گرفتار عذاب  
 دل یہ کہتا ہے کہ پہلے مجھے کیجئے خونساب  
 عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب  
 دل کا یارنگ کروں خون جگر ہونے تک  
 تم سے اور وعدہ وفائی ہو کبھی ناممکن  
 دیکھو لیں خیر کر لائے ہو خدا کو ضامن  
 اپنی اس دار فنائیں ہے بقا ہی کے دن  
 ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن  
 خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک  
 ہو گیا حسن کی ہیبت سے دل کو وہ دو نیم  
 سخت حیرت ہے کہ زندہ ہے کس طرح کلیم  
 فرض عاشق ہے دم جلوہ کرے جان کلیم  
 پیر تو خور سے ہے شبنم کو فتا کی تعلیم  
 میں بھی ہوں ایک۔ عنایت کی نظر ہونے تک  
 ظرف رکھتا ہے تو کہ بادہ پرستی غافل  
 ور نہ یہ بزم رب کی نہ یہ بستی غافل  
 تہجو کو محروم نہ کرنے تری مستی غافل  
 اک نظر پیش نہیں فرصت ہستی غافل  
 گرمی بزم ہے اک رقص شر ہونے تک  
 پلو پچھتے کیا ہو یہ مرزا سے کہ کیسا بے مزاج  
 کل تھی فرصت اسے اندر وہ مصیبت ہونے تک  
 وہ مرض ہے کہ معان نہ دوا کا محتاج  
 غم بستی کا اسد کس سے ہو تہزمرگ ملاج  
 شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

## رویف (دل)

(۴۵)

یہ بے شعور جب سے ہوئی بتلائے گل  
چنتا نہیں ہے اس کی نظر میں سوائے گل  
بھولی ہوئی ہے عہدِ قیام و بقائے گل  
ہے کس قدر ہلاک فریبِ وفائے گل

بلبل کے کار و بار پہ ہیں خندہ ہائے گل

مدت سے یاد گل میں غنا دل کو تھا شغف  
اشجارِ برگِ با سے خالی تھے صفِ بصف  
اب گل سے شاخ شاخ ہوئی جامِ جمِ بکف  
آزادی نسیمِ مبارک کہ ہر طرف  
ٹوٹے پڑے ہیں حلقہٴ دام ہوئے گل

جوشِ بہار میں کوئی غنچہ اگر کھلا  
کتر کسی طرح دلِ صد چاک سے نہ تھا  
سمجھنا نہ کوئی خستگی گل کا مہرا  
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالِ لبِ خونی نوائے گل

جب پائے بوس کی بھی اجازت مجھے نہ دو  
کم قسمتی کا اپنی گلہ مجھ کو کیوں نہ ہو  
مجرم بنوں رگائوں جو آنکھوں پائوں کو  
خوش حال اس حریفِ یہ مست کا کہ جو

رکھنا ہو مثل سایہ گل سر بہائے گل

گل کو جو دیکھتا ہوں کھلتا ہر دلیں خار  
کہتا ہوں ہونہ یہ کہیں تیرے گلے کا بار



اس کے وجود پہ ہے مجھے رشک بار بار      ایسا د کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار  
میرا رقیب ہے نفس عطرائے گل

دل تنگ آگیا ہے غم روزگار سے      فرحت ہو خاک سیر گل ولا زار سے  
خالی ہے ہاتھ سر میں گرانی خار سے      شرمندہ رکھتے ہیں مجھے باد بہار سے  
مینائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

بو باس اس نے حسن میں حاصل ضرور کی      لیکن وہ بات اس میں کہاں تھی نور کی  
نسکین کیا ہو اس سے دل ناہمو کی      سطوت سے تیرے جلوہ حسن غیور کی  
خوں ہے مری نگاہ میں نگ اوائے گل

رکھتا ہے غنچہ دل میں ازل سے چسک      سنبل کو کر رہی ہے پریشاں تری لشک  
نرگس بھی چاہتی ہے تیرے نور کی جھلک      تیرے ہی جلوہ کا ہے پردہ صو کا آج تک  
بے اختیار دوڑے ہے گل در قضاے گل

پھیلی ہے جسکی بوئے دل آویز چار سو      چل چڑ جس سے ہر گل خنداں کو رنگائے بو  
مرزا کو جس کی باغ جہاں میں ہے جستجو      غالب مجھ سے اس سے ہم آغوشی آرزو  
جس کا خیال ہے گل حریب قبائے گل

## رولیف (ن)

(۴۶)

اب وہ دل اور وہ خیال کہاں      وہ تصور وہ دیکھ بھال کہاں  
وہ خوشی اور وہ ملال کہاں      وہ فراق اور وہ وصال کہاں  
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

جب تک آزادہ جہاں ہم تھے      دید بازی میں ہم نے دن کاٹے  
دل ہے اب اور غم ہیں دنیا کے      فرصت کار و بار شوق کسے  
ذوقِ نظارہ جمال کہاں

اب نہ دل میں خیال گیسو کا      اور نہ آنکھیں ہیں محو شوقِ لہ  
و لولہ مٹ گئی جو دل میں تھا      دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رھا  
شورِ سودا کے خط و خال کہاں

کیا کروں گردِ دشتِ زمائے      حوصلے پست کر دیئے دل کے  
نہ رہا وہ سخن : ذوقِ مجھے      تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں  
بہر چکا توں دل میں جتنا تھا      کوئی قطرہ جگر میں بھی نہ رھا

ہمنشیں لمن کیا یہ مجھ کو دیا      ایسا آسان نہیں لہو رونا

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں

تھے کبھی خاک آستانہ عشق      اب نہ وہ ہم نہ وہ زمانہ عشق

جیب پڑتی تو تھے یگانہ عشق      ہم سے چھوٹا قارخانہ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

جو رگِ ردوں اٹھائے جاتا ہوں      ٹھوکر میں صبح و شام کھاتا ہوں

روز ایذا نئی اٹھاتا ہوں      فکر دنیا میں سرکھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہئے مرزا کا حال کیا غالب      بے طرح ضعف ہو گیا غالب

ہے یہ پیری بھی کیا بلا غالب      مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب

وہ عناصر میں اعتدال کہاں

اے مرزا غالب اس شعر کے متعلق عبدالرزاق شاکر کو یہ لکھتے ہیں "بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا کھنٹنا

پہلے سے متروک ہے۔ پیرامری وضع کے صدروں سے محنت نرودی و جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی

حرارت غریبی کو زوال ہے اور یہ حال ہے کہ وہ مضحکہ منہل ہو گئے قوی غالب" وہ عناصر میں اعتدال کہاں۔

کچھ آپ کی غصص نہیں سب دوستوں کو جن سے خط و کتابت رہتی اردو ہی میں نیاز نامے لکھا کرتا ہوں

اس مکتوب میں آگے چل کر فرمایا ہے "اور میں اب انتہائے عمر ناپائیدار کو چھو چکر آفتاب لب با او"

بجوں امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ درگور ہوں۔ کچھ یاد خدا بھی چاہیئے نظم و شری نظم رو کا انتظام

ایزدانا و توانا کی عنایت و اعانت سے خوب ہو چکا ہے اگر اس لے جا با تو قیامت تک میرا نام و نشان

باقی و قائم رہے گا۔" آثار ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

بھاگتا ہوں دام توڑ کے آفت رسیدہ ہوں      بیجا نہیں جو سایہ سے اپنے زمیدہ ہوں  
 ہیبت زدہ ہوں چاشنی غم چشیدہ ہوں      ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں  
 میں دستِ غم میں ہوئے صبا دیدہ ہوں

کہتے ہیں یوں تو سب مجھے با اختیار ہو      لیکن خدا گواہ جو کچھ اختیار ہو  
 مجبور جو ہو پھر اسے کیا اختیار ہو      ہوں درد مند جبر ہو یا اختیار ہو  
 مگر نالہ کشیدہ گر اشک چکیدہ ہوں

چکے ہوئے ہے غصہ غم کا زہر دہن      خوش ذائقہ تلاوتِ جاں سے ہو کیا دہن  
 اس درجہ تلخ تقادمِ آخر مرا دہن      جاں لب پر آئی تب بھی نہ شیریں ہو دہن  
 از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں

جے جس ہوں مثلِ عضوِ معطل پڑا ہوا      جنبشِ مجھے ہو ذرہ برابرِ جال کیا  
 میں لائقِ جزا ہوں نہ مستوجبِ نرا      نے سحر سے ملا کہ نہ ساغر سے واسطہ

میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں  
 ہوں دشمنِ فرشتہ نہ جنِ دہری سے لاگ      حیواں کی تاک میں نہ کسی آدمی سے لاگ  
 اپنے سے ہے لگاؤ نہ کچھ غیری سے لاگ      ہوں خاکسار نہیں مجھ کو کسی سے لاگ  
 نے دانہ فنادہ ہوں نے دام چیدہ ہوں

پوچھو نہ ہمدومری حسرت کی داستاں  
حراماں نصیب کر کے تفضالائی ہے یہاں  
نا کامیاں نصیب میں وہ ہیں کہ الاماں  
ظاہر ہیں میری شکل سے فسوس کے نشاں

خاراں سے دست ہند لال گزیدہ ہوں  
سنبھلنے اپنی زلف کے کھولے نہیں کھنچ  
سبزان باغ ابھی نہیں گرم دلاں و غنچ  
باغ خیال دل سے ٹٹنے ہوئے ہے رنج  
ہوں گرمی نشاطِ تصور سے لغتہ سنج  
میں عنذ لیب گلشن نا آفریدہ ہوں

مسکن نہ آسماں نہ زمیں ہے مری جگہ  
کرسی ہے اور نہ عرش بریں ہے مری جگہ  
میں خود کہیں ہوں اور نہ کہیں مری جگہ  
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ  
ہوں میں کلام لغز و لے ناشفیدہ ہوں

ہے اک زمانہ بربر کہین و مخالفت  
دنیا کو ہے عروج میں میرے مزاجت  
پہناں ہے مشتری کی نظر سے مری صفت  
جو چاہیے نہیں وہ مری قدر و منزلت

میں یوسف بر قیمت اول خریدہ ہوں  
مشرک میرے کیوں ہے زمانے کو قال و قیل  
میں بھی ہوں اپنے رنگ میں بے مثل و بیحدیل  
ہے نیکوں نے فرض کر لیا بد خجہ کو بے دلیل  
اہل و ع کے زمرے میں ہر چند ہوں ذلیل  
پر عاصیوں کے فرقے میں میں ہرگز نہ ہوں

مرزا ہی سے نہیں ہے زمانے کو کچھ حسد  
میرے گئے بن گئے انسان دام و دود  
اس طرح کھائے لینے میں جسکی نہیں ہے حد  
پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد

ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردِ گنہگار ہوں

ہم سے بڑا تو برا ہو تو بھلا کہتے ہیں      لطف بیجا کو جوان پر ہے بجا کہتے ہیں  
کچھ صواب اس نے کیا بھی تو ظاہر ہو ہیں      کی وفام سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں  
ہوتی آئی ہے کہ آچھوں کو برا کہتے ہیں

دل پریشانی ہے مغموموں میں پریشیاں اپنے      ایسی آشفتنہ بیانی کو کوئی خاک سے  
کہہ نہ بیٹھیں کہیں کچھ اور خدا خیر کرے      آج ہم اپنی پریشانی حطران سے  
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

دردِ دل خود بھی جو رکھتے تو سمجھتے اسکو      دردِ انگیز ہیں اندوہ فرا ہیں یہ تو  
سارنگ سے مگر اب تیر یہ کہیں سب سن لو      اگلے وقتوں کے میں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو  
جوئے و لغو کو اندوہ رہا کہتے ہیں

راستہ دن بیتی، یہاں نہج کی حالتِ غش سے      ناکش خاک ہوں تہی ہو بری گشتِ غش سے  
رہتا کمال جاتا ہے ملتی ہو جہلِ غش سے      دلیں جا بے ہوتی ہو فرصتِ غش سے  
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہی ہو تر بخیز شرک ہے دلی سے مفقود      ہم معبود ہیں نہ کہے کے نہ کعبہ معبود  
رواقبہ میں تو صرف ایک جہتِ مقصود      ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود

قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

یوں تو کانٹوں پر ہمیشہ ہمیں ترپایا ہے      اب محبت کا تری لطف مگر پایا ہے  
حالتِ زار پہ تو بے جو ترس کھایا ہے      پائے اوکار چبے تجھے رحم آیا ہے

خارہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

سوزِ باطن کا جو کچھ حال ستم کرنے سنا      دلنشین ہوئے کو تھا ہی کر کیا یک جھجکا  
ہم نے بھی رنگ بیاں کو وہیں اپنے بدلا      اک شہر دل میں ہر اس کو کوئی گھر ایسا کیا

اگل مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

کرتے ہم رد و قدح اس سے تو سہوِ دل ننگ      گفتگو کرتے ہوئے رہتا ہے مادہ بھنگ  
ہاں میں ہاں اسکی ملاتے ہیں تو بڑھتی ہوا ننگ      دیکھ لاتی ہے اس شوخ کی نخوت کیا زنگ

اس کی ہر بات پر ہم نام خدا کہتے ہیں

سن کے یہ سانحہ مرزا سبھی رو دیں شاید      جو سخن سنچ ہیں اس غم کو نہ بھولیں شاید  
بزمِ ماتم ہو پیا بزمِ سخن میں شاید      وحشت و شیفقتہ اب مرثیہ کہیں شاید

مر گیا غالب آشفقتہ نوا کہتے ہیں

۱۵ مہر گیا۔ ایک قسم کی گھاس جسکے متعلق روایت ہے کہ جو اسکو اپنے پاس رکھتا ہے لوگ اس پر مہرمان ہو جاتے ہیں گویا حبیب کا اثر رکھتی ہے جس سے تجھ رحم آیا ہے مانے ہی کچھ لیا ہے کہ تیرے راستے کے کانٹے مہر گیا کا اثر رکھتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے تو ہم پر مہرمان ہوا ہے ۱۲ مہر آشفقتہ نوا۔ پریشان مائیں کہنے والا۔ وحشت و شیفقتہ دونوں غالب کے ہم عصر شاعر اور دوست تھے۔ اس شعر میں وحشت و شیفقتہ کے الفاظ خاص طور پر بھونکی ہوئی ہیں۔ وحشت صاحب کا نام غلام علی خاں اور شیفقتہ کا نام نواب مصطفیٰ خاں تھا۔ وہ جہانگیر آباد کے رئیس تھے جنکا شیفقتہ صاحب ایک مانے ہوئے گن فہم اور کس کس تجھے جو دہلی میں رہنے تھے وہ غالب کی عظمت کے حد سے زیادہ تھے

عشق کیا جہل قمری طوق گردن میں نہیں      وہ جنوں کیا پھڑوں کز زم اگر تن میں نہیں  
اسکو جنوں کیا کہیں جس کا مکان بن میں نہیں      آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں

ہے گریباں سنگ بیراہن جو دامن میں نہیں

پہلے دامن میں جو گلکاری تھی گلشن میں نہیں      لطفِ خونباری جو تھامے کلاں میں نہیں  
دل تو دل اب تو لہو گہاے گردن میں نہیں      ضعف سے لے کر کچھ باقی مستی میں نہیں

رنگ ہو کر اڑ گیا خوں کے دامن میں نہیں

چونکہ دیواریں ہوئی تھیں سداہ آفتاب      اسلئے وہ در ہوا ہے سجدہ کاؤ آفتاب  
مٹی جو زردیدہ نگاہی اک نگاہ آفتاب      ہو گئے ہیں جمع اجزاء نگاہ آفتاب

ذرا اسکے گھر کی دیواروں کے وزن میں نہیں

در سیر خانہ کا میرے اک دربان خیر ہے      موت کے مزے میں ہوں جیسے طبیعت خیر ہے  
ذراے افکار ہیں زمین خاکِ سید کا ڈھیر ہے      کیا کہوں تاریکی زندانِ غم اندھیر ہے

یہ بنہ نور صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں

اس کو مارا اس کو زندہ کر دیا عجائز سے      اسکو غم سے کیا بسمل تو اسکو ناز سے  
گھر بنایا اس نے ہر دل میں نئے انداز سے      رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویران ملک سے

بقیہ ۵۵-۱۔ معتقد احمد رشکس نے ان دونوں کو اس مقطع میں یاد کرتے ہیں۔ ۳



انجن بے شمع ہے گر برق خرمین میں نہیں

غم بھر میں اس نے لے دیکر فقط لیکھا طعن دیکھے انصاف سے تو سرسبز بجابے طعن  
نہ فقط نا تجربہ کاری کر یہ کرتا ہے طعن زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن  
غیر سمجھا ہے کلدت زخم سوزن میں نہیں

جیتے ہی اہل شک گل کے خوب نظائے ہوئے مرے بھی پوئے یوں ہی ارمان لے سائے ہوئے  
قبر میں پیش نظر وہ گل سے رسائے ہوئے بسکہ ہیں ہم اک بہار نازکے مائے ہوئے  
جلوہ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

کرنہ درماں چارہ گر مجھ خستہ ورنجور کا ہر مسام اک زخم ہوگا اس تن محروم کا  
دل کی حالت دیکھ چھٹا ہو گیا زبور کا قطرہ قطرہ اک ہیو لاپے نئے ناسور کا  
نوں بھی ذوق درد سے فاسخ مئے تن میں نہیں

کثرت سے پر جو شجی پر مینما نہ کو سقی ڈٹ گیا میں زندہ پینے پر تو قلعی کھل گئی  
ایک کش میں تم کے خم خالی کئے اور بس نہ کی لے گئی ساقی کی نخوت قلمز آشامی مری  
موج سے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

غم تو آئیکلے بھر کیونکر نہ اٹھے دل سے دوو کیا ادھیڑا پنج پیری نے تن کا تار و بود  
نیستی ہے اپنی ہستی اور عدم اپنا وجود ہو فشا رضعف میں کیا ناتوانی کی نمود  
قر کے جھکنے کی بھی گنجائش مئے تن میں نہیں

کس طرح مرزا ہو اسکی دیدہ خلقت میں قدر مال میں جس کا نہ حصہ ہو نہ ہولت میں قدر

قد کی شمر عبت ہر جب ہو قسمت میں قدر  
حقی وطن میں شان کیا غالب ہو غرست میں قدر  
بے تکلف ہوں ہر مشت خس کر گلشن میں نہیں



اب جو مستانہ گھٹائے برستی ایک دن  
آؤ مل جل کر اٹھائیں لطف ہستی ایک دن  
دیکھ لو گے بخودوں کی تیز دستی ایک دن  
ہم سے کھل جاؤ بوقت بے پرستی ایک دن  
در نہ ہم پھیریں گے رکھ کر ہر دستی ایک دن

جب گرد میں دام تھے پر مغال تھا ہریاں  
رات دن پینے پلانے سے تھی تب فرصت ہل  
مظنی میں بھی نہ اس جسکے سے باز آن زباں  
قرص کا پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں  
رنگ لائے گی ہماری فاقہ ہستی ایک دن

ہے بہا اس دور کی ایک ایک ساعت جانے  
اس کی رونق کو نہ کچھ بے قدر و قیمت جانے  
زار نالی بھی جو ہو تو ساز عشرت جانے  
نغمہ ہائے غم کو بھی اسے دل غنیمت جانے  
بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

زعم دانانی پر اس درجہ نہ کر ناداں نہ ہو  
مثل گل پڑمردہ ہو گا ورنہ یوں خداں نہ ہو

اے مودی محمد حسین آرزو ہے اب حیا میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ مرزا غالب قضا رہ گئے قرض خواہوں سے  
نالس کر دی۔ جواب دی ہی میں طلب سے گئے بمقامی صدر الدین صاحب کی عدالت تھی جس وقت یہی پر گئے انھوں نے  
یہ شعر طرہ صاعہ قرض کی پیتے تھے اے آرزو نے مدعی کو روپے اپنی گروہ سے ادا کر دینے اور اس طرح مسرزا  
غالب قرض سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۲

چاردن کی رفعت موبہوم پر نازاں نہ ہو غرہ اوج بنائے عالم امکان نہ ہو  
 اس بلندی کے نصیب نہیں ہر پستی ایک دن  
 شب سرمحل جو ہاتھ پائی وہ کرنے لگا کون کہتا ہے کغیروں نے اسے کسنادیا  
 اس بے برتاویں مژرا نہیں اس کی خطا دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہ تھا  
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشدستی ایک دن

۵۱

ظاہر میں گو شغیف نہیں جہرباں نہیں ان کے ہمارے ربط کو فی درمیاں نہیں  
 لیکن خفا بھی ہم سے وہ جان جہاں نہیں ہم پر جفا سے ترک وفا کا گماں نہیں  
 اک چھپرے و گمر نہ مراد امتحاں نہیں  
 تم پوچھنے جو آئے تو مجھ پر کرم کیا کچھ بھی اگرچہ رسم عیادت نہ کی ادا  
 کیا کم ہے یہ نگاہِ ترحم سے دیکھنا کس منہ سے شکر کیجئے اس لطیفِ خاص کا  
 پرستش ہے اور پائے سخن درمیان نہیں  
 ہوتا نہیں وہ رام تو ہے اس کارم عزیز بڑھتا ہو جس سے شوق و شہتہ کیا ہر کم عزیز  
 خفگی کا بھی تو شوخ کی ہر کم کو غم عزیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
 ناہریاں نہیں ہے اگر جہرباں نہیں  
 کیا جانے ذوقِ جور و جفا کو عد و ساینر ہم جس سے یاد آتے ہیں ہر ظلم ہی وہ چیز

اس لطیف معنوی کی کہاں غیر کو تیز ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز  
 نامہریاں نہیں ہے اگر مہریاں نہیں  
 کیا بات میں نے کی ہے کہ تم کو بری لگی حیرت سی نام بوسہ لب سن کے ہو گئی  
 میں نے کیا سوال تو مجھ سے خطا ہوئی بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی  
 آخر زباں تو رکھتے ہو تم گودہاں نہیں

## قطع

ہر چند خولے یار میں اک التہاب ہے ہر چند مجھ کو اس کو حضوری عذاب ہے  
 ہر چند غیظ و غصہ بوقت خطاب ہے ہر چند جاں گدازی قہر و عتاب ہے  
 ہر چند پشت گرمی تاب و توان نہیں  
 لیکن جب اس سے رحم و کرم کی امید ہے جو گفتگوئے تلخ ہے حلوائے عید ہے  
 اس ذوق و انبساط میں شکوہ بعید ہے جاں مطرب ترا کہ ہل من فریب ہے  
 لب پر وہ سنج زمرۃ الاماں نہیں  
 صادق اگر ہے عشق تو پھر کیا ہر خوف و بیم کر نذر یار گو ہر جاں بھی نہ ہی بیم  
 پیدا وہ درد کر کہ ہو حال جگر سقیم خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم  
 دل میں چھری چھو جو مرہ خونچکاں نہیں  
 بے داغ سینہ ہو تو د سینہ اسے کہو خالی ہو سوزے تو جگر کو نکال دو

مضطر اگر نہ ہو تو سلام ایسی جان کو ہے ننگِ سینہ دل اگر آلتِ لہر نہ ہو  
 ہے عارِ دل نفس اگر آذرِ فشاں نہیں  
 دشت میں مرکب پھڑپھڑاتا ہوں کھاکے پیچ و تازا دیوار و درگزی کہیں ہو کچھ تو انقلاب  
 دیوار ہوں تو کیا مجھے آنا نہیں حساب نقصان نہیں جنوں میں بلا ہے ہو گھر خراب  
 سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں  
 نغائبِ ندگی کا مادہ میری سرشت میں بیتِ انعم میں عمر کٹی یا کفشت میں  
 ہوتا تھا اور خاک مے بختِ زشت میں کہتے ہو کیا لہجہ تری سرِ نوشت میں  
 گویا جہیں پر سجدہ بت کا نشان نہیں  
 ہو حرف گیر اگر ہے زباں خاص و عام کی پروا نہیں کسی کے خیالاتِ خام کی  
 شہرت ملائکہ میں بھی ہے میرے نام کی پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی  
 روح القدس اگر چہ ملا ہنرِ باں نہیں  
 مرزا سوالِ بوسہ لب کو وہ ہر گھڑی سن کر چوٹا لٹا ہے تو سوچی ہو دور کی  
 جب جاں بلب سے گاتو خود ہو گاتقضي جان ہے بہائے بوسہ وے کیوں کہے ابھی  
 غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

میں جو آوارہ ہوں اس میں مری تھیں نہیں میری تحریر جہیں لائے تفسیر نہیں

قابلِ چارہ مری گردش تقدیر نہیں مانعِ دشتِ نوردی کوئی تندر نہیں

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

دل کا اک لورہ ہے جو لئے پھرتا ہے کشتاں بخود اتنا ہوں کہ ہے راہ بھی نظروں نہاں

کوئی منزل بھی تو پیدا نہیں جزوِ مگلاں شوقِ اس دشت میں دوڑاں ہر جھکو کر چلاں

جادہ غیر از نگہ دیدہ تصویر نہیں

جان تو ندر میں جلاد کو دی جاتی ہے اس کے خوش کرنے کی تدبیر تو کی جاتی ہے

لیکن امیدِ جفا قطع ہوئی جاتی ہے سیرتِ لذت آزار رہی جاتی ہے

جادہ راہِ رفتِ بزدل شمشیر نہیں

نہیں ناکامیِ فریاد کی پروا مجھ کو نہ خیالِ آہ کی برباد روی کا مجھ کو

ہو نہ پوری نہ سہی ہے تو تمنا مجھ کو رنجِ نو مبری جاوید گوارا مجھ کو

خوش ہوں گزراں زبونی کشِ تاثیر نہیں

خشک ہو زخمِ توبے چینِ دل اپنا ہو جائے جب تک اک زخمِ بیاور نہ پیدا ہو جائے

سنگِ طفلان جو نہ کھاؤں مجھے سودا ہو جائے سر کھاتا ہے جہاں زخمِ سراچھا ہو جائے

لذتِ سنگِ باندازہ تقدیر نہیں

کر لیا عفو کا جب وعدہ راسخ اس نے کون شرمندہ ہو پھر شرمِ گنہگاری سے

نفس کہتا ہے کہ لے خوب گناہوں کے مے جب گرمِ رخصتِ بیباکی و گستاخی دے

کوئی تقصیر بجزِ نجلتِ تقصیر نہیں

وہ بھی مرزا سا جریدہ ہے بقول ناسخ صاحب اوصاف حمید ہے بقول ناسخ  
ہند میں شاعر چمیدہ ہے بقول ناسخ غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ  
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد تیر نہیں

تری رد گزریں جو ہم دیکھتے ہیں فضا ایسی جنت میں کم دیکھتے ہیں  
گل و لالہ ہر صبا ہم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں  
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں  
ہوئے ہم جہ مشتاق اس کے سخن کے یہ آثار گویا ہیں دیوانہ پن کے  
دہن ہی نہیں اس بت سحر فن کے دل آشفنگاں خال کنج دہن کے  
سوید میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

۱۔ یہ ترقی کی علامت اور ان کے کلام کی عظمت کا ہر ساعے اعتراف کیا ہے دوقی نے کہا ہے  
ہو پھر ہو امتیر کا اعدا نصیب دوقی یاروں سے بہت دور غزل میں مارا  
ستودار یا لکھی کہا ہے ستودا تو اس غزل کو مرل دو غزل کہہ نہ ہونا پڑا ہے تیرے استاد کی طرف  
عالم یہ ہے استاد اور گزراں ہر استاد کا اس رائے سے اتفاق کہ نامیر تقی تیر کے طبع یا بدست یا ہوسے میں کوئی مستد  
باقی نہیں رہے جیسا کہ انھوں نے کہا ہے  
رہنچے کے تمہیں استاد ہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر سے تھا  
ناسخ لکھنؤ کے مشہور ساعر اور اپنے زمانے کے استاد تھے انھوں نے فرمایا ہے کہ جو شخص میر تقی میر سے عقیدت  
ہیں رکھتا وہ بے بہرہ ہے غالب نے مقلع میں ناسخ کے مہر تالی کو بابر صا ہے ۔ ۱۲

ترے قدموزوں نے پایا وہ عالم      عجب کیا قیامت کرے غیر مقدم  
جو تو ہو خسران تو محشر مسلم      ترے سرو قیامت سے اک قد آدم

قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

جو ہے حیرت آئینہ تجھ کو پیاری      تو اس سے بھی بڑھ کر ہے حیرت ہماری  
فقط اک نگہ کی ہے امیدواری      تماشا کر اے مومن داری

تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

رہے ہجر میں رات بھر گرم نالے      گئے قافلے جانبِ عرش ان کے  
نہ ہوتا نشان تو نشان بھی نہ پاتے      سراغِ توفیق نالے داغِ دل سے

کر شبرو کا نقش قدم دیکھتے ہیں

نہیں رکھتے مرزا کسی سے مطالب      نہ دل جانبِ عیش دنیا ہے راغب  
تمنا ہے زر ہے نہ دولت کے طالب      بنا کر فیروں کا ہم بھیس غالب

تماشا ہے اہل کرم دیکھتے ہیں

جلتا ہوں ان کی گرمیِ قہر و عتاب میں      کیونکر مرے نہ پاؤں عذابِ عتاب میں  
پوچھو نہ مجھ سے گرمیِ دوزخ کے باب میں      ملتی ہے خوشے یار سے نارِ التہاب میں

کافر ہوں گر نہ ملتی ہو لذتِ عذاب میں

۱۵ ماہیہ اعلیٰ صوفیہ



آیا ہوں درد و غم کے لئے انتخاب میں دن زندگی کے کاٹ رہا ہوں غلاب میں

ہوں غمہ دراز سے اس پہنچ و تاب میں کب سے ہوں کیا بتاؤں جہاں خراب میں

نبھائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

کیا کہتے ہوتی تھی شب غم کس طرح بسر اختر شمار یوں ہی میں ہو جاتی تھی سحر

توڑا ستم یہ اور نیا چشم شوق پر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

آنکھوں میں پیشتر ہی نہ تھا نیند کا گزر کرتا تھا صبح ہجر میں سر پیٹ پیٹ کر

غفلت جو روتے روتے ہوئی شب کسی قدر تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر

آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

لکھ تو دیا انہیں کہ مرا حال ہے زبوں ہے ان سے آرزوئے تسلی تزا جنوں

آگاہ ان کی عادت و خصلت و خوبیوں قاصد کے آتے آتے خط اکا اور لکھ رکھوں

میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے تو ان میں

رہتے تھے ہم پیالہ جہاں ان سے خاص عام اٹھنا تھا ایسی بزم سے میں روز نشہ کام

پینے میں آج مجھ کو نہ ہو کس طرح کلام مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا و کجام

ساتی نے کچھ ملانہ دیا ہو شراب میں

لے تاہ آتش و دھنچ اہتاب نخلوں کا بحر کنا۔ فرماتے ہیں محبوب کی بدخوئی بھی میرے لئے سامان راحت ہے۔ دوزخ

کا آگ بھی نخل زنی اور بھرنے میں اس کی خوشی سے متا بہت کھتی ہے اس لئے یہ بھی میرے لئے سامان راحت ہے اگر میں

ایسا نہ سمجھوں تو کافر ہوں عشق کا ایمان یہی ہے ۱۲۰

آنکھیں بھی راہ میں جو بچھاتا ہوا چلے      ممکن نہیں کہ مکر و فسوں غیر کا چلے  
چالیں ہزار بار سے یہ پردہ غاپلے      جو مکر و فاف ہو فریب اس پہ کیا چلے  
کیوں بدگمان ہوں دوست دشمن کے بائیں

دھڑکا مجھے تو یہ ہے کہ دشمن نہ امے      جاتے ہوئے تمہیں مے گھر سے نہ دیکھ لے  
تم ہنستے ہنستے ہو گئے خاموش کس لئے      میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ قریب سے  
ڈالاجے تم کو وہم لے کس بیچ و تاب میں

وہ آن میرے گھر جو چلے آئے مستے      شکر خدا کہ ہو گئے قصے تمام طے  
جاتے لے وصال کا وعدہ بھی کر گئے      میں اور خط و صل خدا ساز بات ہے  
جاں نذر دینی بول گیا اضطراب میں

سیردہ کچھ اثر ہیں نمایاں عتاب کے      لیکن ہیں چپ خیال سے شرم و حجاب کے  
آثار بات بات میں ہیں بیچ و تاب کے      بے تہوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے  
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

آنا ہے یوں تو ان کو لڑانا نگاہ کا      نظر میں بچا کے سب کی ملانا نگاہ کا  
آفت ہے اُن مگر نہ اٹھانا نگاہ کا      لاکھوں رگ و ایک پیرانا نگاہ کا  
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

لے لٹاؤ سے ٹاؤٹ یا محبت مرا ہے۔ فرماتے ہیں دوست کی لاکھوں لگاؤ میں ایک طرف اور لگاؤ کا پیرانا ایک طرف۔ اسی طرح مصروف ثانی میں لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور غصہ میں بگڑنا ایک طرف۔ دونوں مصرعے ہمہ اند اور لا جواب ہیں۔ عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ ایسا ہی گزرتا ہے معشوق کی (باقی صفحہ ۹۷)

وہ نالہ جو کہ عرشِ معلٰی کو بھی ہلائے      وہ نالہ جو زمین کو بھی زلزلے میں لائے  
وہ نالہ اور کان تک اس شورخ کے بجائے      وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے

جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

جادو وہ چیز ہے کہ جو اس کو عمل میں لائے      مشکل سے مشکل امر کو آسان کر دکھائے  
لیکن مجھے یہی تو ہے افسوس ہائے ہائے      وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے

جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

تھے یا ترکہ پیالہ ہمارے سبھی کبھی      دیکھانہ ہم نے ہوش میں مرزا کو بھی کبھی  
وہ دن کہاں کہ مشغل سے فرصت نہ تھی کبھی      غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روزِ ابرو شبِ ماہِ تاب میں

۵۵

جامِ سبو کو رکھ نہ بچا کہ سحاب میں      شامل نہ کر صبوحی کو شب کے حساب میں  
وہاں کچھ کمی نہیں کہے تو اضطراب میں      کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں  
یہ سوئے فتن ہے ساقی کو تر کے باب میں

گردِ شہ سے پیوست نہ لگاؤٹ عاشقی کے لئے ہنس بڑی چیز ہے اور عاشقی کی نظر میں مکہ چرانا لگاؤٹ سے بھی زیادہ  
دلفریب ایک طرح معنوں بناؤنگار میں مہابت دلفریب ہونا ہے مگر اس کا عہد سے مجھ پر ماہکے بناؤ سے بہرہا دلربا ہو جاتا؟  
مولانا آئندہ جو بیٹہ سادہ کلام کو پسند کرتے تھے اور عائشہ کی پیروی گوئی پر حرف رکھتے تھے اس شو کو سنکر نہایت  
خوش ہوئے مگر طرزِ بطور مزاح یہ کہا یہ تو ہماری طرز کا شعر ہے اس میں غالب کی کون سی خوبی ہوئی۔ ۱۳

یا تو ملائکہ سے بھی مخافرتیہ بلند ہم سا نہیں ہے یا کوئی اب خوار و مستمند  
 پہونچا رہا ہے ہر تنفس ہمیں گزند ہیں آج کیوں ذلیل کر کل تک تھی پسند  
 گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

آخرب کیوں روح کا قالب سے انزع کیوں بڑھ کے کرب سانس کا ہونا ہے انقطاع  
 سننے سے اسکے کہتے ہیں کیوں ہوش اوداع جان کیوں نکلے لگتی ہے تن سے دم سماع  
 گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

کہتے ہیں صاف صاف یہ انداز چال کے لینا نہیں دم سے ادھر دم کہیں اسے  
 بے اختیار ہوں کہیں مجھ کو گرانہ دے رو میں ہے خوش عمر کہاں دیکھے تھے  
 نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

کی لاکھ فکر ہستی آشیاب میں پے پے قصہ ہوانہ ان کے وجود و عدم کا طے  
 جہنم میں مبتلا ہوں کہیں بھی ہوں طرف نشے انسا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بے  
 ہنسا کہ وہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں

ایجاد کیا کہ موجد و وجود ایک ہے سب معبدوں میں عابد و مبود ایک ہے  
 کیا ذکر سجدہ ساجد و مسجود ایک ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے  
 جہاں ہوں پھر شاہدہ ہے کس حساب میں

موج و حباب میں ہے مقرر وجود بحر ان کا وجود بھی ہے سراسر وجود بحر  
 کہئے انھیں عرض تو ہے جو ہر وجود بحر ہے مشتمل نمودِ صورت پر وجود بحر

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں  
 بیٹے ہیں تازہ حسن سے ہم کو ہوا لگی  
 بے رہروں کے واسطے سامان گوی  
 جب چھپ سکے نہ ذات سے پرے کی کیا رہی  
 شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے ہی  
 ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں  
 گو خود نما نہیں ہے وہ پردہ نشیں ہنوز  
 نظارگی نہیں کوئی اس کا کہیں ہنوز  
 ہے مونا ز خود بھی وہ ناز آفریں ہنوز  
 آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز  
 پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں  
 اشیا کی ہے تصور اشیا سے سب نمود  
 دیکھا جو غور سے تو خیالی ہیں سب جود  
 ہستی کی ولہے کی ہڈت ہرست بود  
 ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود  
 ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں  
 مرزا کو ایک عمر سے ہے جستوئے دوست  
 کچھ آرزو نہیں ہے بحر آرزوئے دوست  
 آنکھیں ہیں ہمیشہ کی طرف دل ہر سوئے دوست  
 غالب بنیم دوست کراتی ہر سوئے دوست  
 مشغولِ حق ہوں بندگی بو تراب میں

کس طرح رو کوں گریہ شام و سحر کو میں  
 کس کس کے سچ و غم میں کھپاؤنگا سحر کو میں  
 رولے میں روزِ بیٹیوں کہیں چشمِ ترکو میں  
 حیراں ہوں لکھو روؤں کہ بیٹیوں کے ترکو میں

مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوم گزر کو میں

مانا نہ دل سے تیرا چہ دشمنوں کو دوں      آگاہ تیرے نام سے اغیار کو کروں  
آوارہ و خراب تری جستجو میں ہوں      چھوڑا نہ رشک لے کر تیرے گھر کا نام لوں

ہراک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جس راہ میں قدم کا بھی رکھنا تھا ننگ عار      طے سر کے بل کیا اسے اللہ رے اضطراب  
دم بھر کو بھی تو دل لے نہ لینے دیا قرار      جانا بڑا رقیب کے در پر ہزار بار

اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

آہ میرے قتل کو کس زعم پر ہوئے      انجان تم نے جان یا جان من مجھے  
دھمکی میں تو وہ آئے نہ معلوم ہو جسے      ہے کیا جو کس کے بازو ہو گے میری بلا ڈرے

کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں

میں جانتا تھا مجھ کو فقط ان سے کام ہے      لغت ہو یا سوا سے تو سودائے خام ہے  
اس پر بھی ہے بہ قدر تو میرا سلام ہے      لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ نام ہے

یہ جانتا اگر تو سنا تا نہ گھر کو میں

کرتا ہوں سو قدم بھی اگر طے نہ تو کیسا تھ      یعنی ہراک قدم پہ ہوں کہ خضر نو کیسا تھ  
آہستہ رو کے ساتھ کبھی تیرو کیسا تھ      چلتا ہوں تھوڑی دور ہراک رو کیسا تھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

ہر چند بت کدوں ہی میں سب عمر دی گزار      لیکن خدا گواہ کہ ایماں ہے برقرار

ہاں شوق دید کا تو ہوں بیشک گناہگار خواہش کو امتحانوں نے پرستش دیا قرار

کیا پوچھا ہوں اس بہت بیدار کو میں

پھر گم ہوا تلاش میں اس کی میں دلفگار ہوش و حواس پر نہ رہا پھر کچھ اختیار

پھر سعی و جستجو کا جنوں سر پہ ہے سوار پھر بخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار

جاتا و گرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

پرساں حال کوئی ہنر کا نہیں رہا باقی جہاں میں قدر ہنرور نہیں ذرا

مجھ کو یہ زعم اب بھی ہیں گاہک ہزار ہا اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا

سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

مرزا میری دعا بھی یہی ہے بعد نیاز دیکھوں جمال بار میں اے رب کار ساز

جس طرح پہلے کہہ گیا ہے اک سخن طراز غالبؔ خدا کرے کہ سوار سمندر ناز

دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

اے مقطع میں اب علی بہادر جاں وائی باندہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے مرزا غالب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا

ایک خط میں انوار الدولہ رفعتی کو یوں تحریر فرماتے ہیں میرے باندہ بندیل کھنڈڑ آنے کا میں نے سب سامان کر لیا

ڈاک میں روپیہ ڈاک کا دے دیا قصہ بہتہا کہ فتح پور تک ڈاک میں جاؤں گا وہاں سے نواب علی بہادر کے ہاں کی

سواری میں جا کر باندے میں ہفتہ گھرہ کر کالی ہو تا ہوا آپ کے قدم دیکھتا ہوا سبیل ڈاک دلی چلاؤں گا

ناگاہ مصور والا بیمار ہو گئے (ظہر بادشاہ) اور مرض نے طول کھینچا وہ ارادہ قوت فعل میں آیا۔



کون کہتا ہے خفا مجھ سے وہ مغرور نہیں      کینہ و بغض جو مجھ سے ہے وہ متور نہیں  
 لے سکے نام مرا کوئی یہ عقدور نہیں      ذکر میرا بدی بھی اسے منظور نہیں  
 غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں  
 بعد اک عمر کے بیدار ہوا طالع شوق      خوش نصیبی ہے کہ چرکا تو ذرا طالع شوق  
 آج تو برسرِ یاری ہے مرا طالع شوق      وعدہ میر گستاں ہے خوشا طالع شوق  
 مردہ قتلِ مقدر ہے جو مذکور نہیں  
 ہے فقط نقطہ موہوم اگر ہے عالم      دہن اس شونخِ دل آرا کا مگر ہے عالم  
 وہم ہی وہم ہے گو پیشِ نظر ہے عالم      شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم  
 لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں  
 غور سے دیکھ اگر رکھتا ہے چشمِ باطن      تجھ پہ کھل جائے گا یہ عقدہ مشکل کُن  
 جزو ہو کل سے جدا یہ نہیں ہرگز ممکن      قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن  
 ہم کو تقلید تنگِ ظرفی منصور نہیں

۱۔ عاتب صاحب نے ایک خط شاہِ عالمِ مہروئی کو لکھا :-

مشفق، کرمی! چودھری عبدالغفور صاحب کو میرا سلام کہئے گا اور یہ پیغام پہنچائیے گا کہ حضرت صاحبِ عالم  
 کی متنائے دیدار بقیدِ مہرہ کتابہ اس سے ہے کہ اور کسی کا بھی دیدار مطلوب ہے۔ خواہش وصلِ مقدر و زورِ جود کو  
 نہیں۔ معروضاتی ترمیم کے ساتھ لکھا۔



وائے ناکامی امید کہ ہمت نہ رہی ہار غم جس سے اٹھاتے تھے وہ قدرت نہ رہی  
خوصلہ دل کا ہوا پست وہ جرات نہ رہی حسرت لے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی  
عشق پر عہدہ کے گوں تن رنجور نہیں

ہنس کے کہتے ہیں گئے آپ اگر جنت میں ہوں غے غلمان ہی غلمان ہاں یا جو رہیں  
کچھ تعجب نہیں جو آپ وہاں جو رہیں میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں نصیب  
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم جو نہیں

یہ تو ممکن نہیں تو دل سے مجھے بھولا ہو ہاں جو اغماض سے لے کام تو چارہ کیا ہو  
کچھ بیان بھی رہے یاد کا تو اچھا ہو ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو  
تو تغافل سے کسی رنگ میں معذور نہیں

لے خوش از ہم طرب جس میں ہم ہیں ہم لوگ دافح رنج و الم دشمن غم ہیں ہم لوگ  
آج تک راہرو نقش قدم ہیں ہم لوگ صاف ورد کی شہ پیمانہ ہم ہیں ہم لوگ  
وائے وہ بادہ کہ افشردہ انگور نہیں

ہے فدائی مرے نکمتوں کا فدائی غالب میری حکمت کا شاگر ہے شنائی غالب  
پوچھو مرزا سے مری نغمہ سرائی غالب ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب  
میرے دعوے پر یہ جہت ہے کہ مشہور نہیں

قابل رجز فغان دل ناشاد نہیں آہ وزاری یہ مری لائق ایراد نہیں  
ہے فقط یاد دہانی کوئی فریاد نہیں نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں

ہے تقاضا، جہاں شکوہ بیدار نہیں  
 عاشقوں کو نہیں محبوبے جاں بھی محبوب  
 باں سمجھتے ہیں رضا جوئی دشمن محبوب  
 ننگِ عشاقِ مخافہاد کا بیجا اسلوب  
 عشق و حروری عشرت گہر کی کیا خوب  
 ہم کو تسلیم کنو نامی فرحاد نہیں  
 رکھتی نخی خانہ نشینی تنگ دوسے حروم  
 اب کاوٹ دم و حشت ہو نہ دل ہے مغموم  
 گویا باں میں ہے آبادی و رونقِ مقدم  
 کم نہیں وہ بھی خرابی میں یہ وسعت معلوم  
 دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھریا د نہیں  
 بر تغیر سے زمانہ کے ہے عبرت مطلب  
 دور اس کا سبق آموزی عالم کا سبب  
 یہ مودب وہ ہے جو خوب کھانا ہے ادب  
 اہل بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب  
 لطمہ موج کم از سیلی استاد نہیں  
 کس خموشی سے توجہ لائے ہم جو رجوا  
 آہ و نالہ کو کیا ضبط سمجھ کر شکوہ  
 پھر بھی سمجھانہ تم گارے پا بندِ رضا  
 وائے حرومی تسلیم و بداحالِ وفا  
 جانتا ہے کہ ہمیں طاقت فریاد نہیں  
 اشیانے سے قدم اب تو نکال اپنا کہیں  
 اب نہیں ہے وہ زمانہ کہ رہے گوشہ نشین  
 شکر کراں کوئی دام نہیں فرشِ زمیں  
 بدگل کے تلے بند کرے بے گل چیں  
 مرده اسے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں  
 دل کے لینے کو تو ہر دم تھا تقاضا لا لا  
 بوسہ مانگا تو بہ تکرار یہ بولا لا لا  
 ف خوب گل چہرے اڑا کوئی حرام ہی نہیں۔

مقا تو معدوم دہن لانے معما کھولا      نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا  
 دی ہے جائے دہن اس کو دم ایجا نہیں  
 شبنم اس عشرت گلزار یگریاں کیوں ہے      دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے  
 منقبض غنچہ گل وقت بہاراں کیوں ہے      دیدہ نرگس حیرت زدہ حیراں کیوں ہے  
 گر چہ راغان سر رہ گزر بار نہیں  
 تم اگر بھول گئے اپنی حکایت غالب      سن لو مرزا سے وہ پردہ روایت غالب  
 ہو گئی سہو کی یہ کیا تمہیں عادت غالب      کہنے کس منہ سے ہو غربت کی شرکایت غالب  
 تم کو بے مہری یا ران وطن یاد نہیں

مرے عقائدِ راسخ میں کچھ فساد نہیں      خدا نخواستہ میں منکرِ معاد نہیں  
 غلط کہ یاد مجھے طولِ روزِ داد نہیں      نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں  
 شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں  
 یہ بات ساقیِ ہوش نے کیا بنائی ہے      کہ ہو نہ ابر تو پیٹنے میں کیا برائی ہے  
 ہمیشہ کیا اسی صورت سے پی پلائی ہے      کوئی کہے کہ شبِ مر میں کیا برائی ہے  
 بلا سے آج اگر دن کو ابر باد نہیں  
 کریں رقیبِ برائی بھی تو بُرا نہ کہیں      بھلائی لاکھ ہو مجھ سے مگر بھلا نہ کہیں

کبھی زباں سے کوئی کلمہ خیر کا نہ کہیں جو آؤں سامنے ان کے تو مرجانہ کہیں

جو آؤں پاس سے ان کے تو خیر یا نہیں

دل و ہجر غم و ایزائے رشک بہتے ہیں سرشکِ خونِ جگر چشمِ تر سے بہتے ہیں

عرو کے ساتھ وہ مصروفِ عیش ہوتے ہیں کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں

کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

کھلا ہی رہتا ہے اٹھوں پہر فیضِ کباب اس آستانے سے ملتا نہیں کسی کو جواب

جو صرف راہِ خدا ہو نہیں کچھ اس کا حساب علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

گدائے کو چھ میمنہ نامراد نہیں

رہے جہان میں ہم مبتلائے رنجِ مدام کھلی جو آنکھ تو دیکھانہ بزمِ غم و آلام

سنا نہیں کبھی ہم نے سرور و عیش کا نام جہاں میں ہوں غم و شادی ہم ہیں کیا کام

دیا ہے ہم کو خزانے وہ دل کشاد نہیں

اک التماس تو مرزا کی بھی سنو غالب کرو وہ بات نتیجہ بھی جس کا ہو غالب

خفیف ہو گے یہ چھیڑاں سے چھوڑو غالب تم انکے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب

یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

روز مضمون نیا باندھتے ہیں روز مرہ بھی جدا باندھتے ہیں

تجھ کو ہم برق ادا باندھتے ہیں تیرے تو سن کو صبا باندھتے ہیں  
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

نالہ دل کی حقیقت کیا ہے کامیاب اس سے کوئی ہوتا ہے  
چھیڑنا اس کو فقط منشا ہے آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے  
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

تجھ کو وہ چال ہے حاصل لے عمر دم میں لے کرتی ہے منزل لے عمر  
تیری رفتار ہے کامل لے عمر تیری فرصت کے مقابل لے عمر  
برق کو پا رہنا باندھتے ہیں

بند کا جب کہ ہے بندہ مفہوم مرگ کی پھر ہے توقع موہوم  
کیوں رہیں شوقِ اجل میں مفہوم قید ہستی سے رہائی معلوم  
اشک کو بے سرو پا باندھتے ہیں

سر میں رکھتا ہے نہ یہ نشہ مل نہ اسے نازش عشقِ بلبیل  
ناز ہے حسن پہر اپنے باکل نشہ رنگ سے ہے واشد گل  
مست کب بند قبا باندھتے ہیں

ان کی بندش کو سخن میں مت پوچھ کس طرح لیتے ہیں تمہیں مت پوچھ  
شعرا کی غلط آئیں مت پوچھ غلطیہائے مضا میں مت پوچھ  
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

مجھ سے وحشی کا کیا کیا درماں ڈال دی پاؤں میں گویا جولاں  
 چارہ گراپنے ہیں کتنے ناداں اہل تدبیر کی دامانہ گسلاں  
 آبلوں پر بھی حسا باندھتے ہیں  
 تھے وہ مرزا ہی سے پیماں غالب ہم سے دھوکا نہیں آساں غالب  
 ہم کو سمجھا کوئی ناداں غالب سادہ پرکار ہیں خوباں غالب  
 ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۶۱

جب تیری خاک رہ کی برابر نہیں ہوں میں کیا شکوہ سنچ جو مقدر نہیں ہوں میں  
 بے تے میں سنگ در کا بھی ہمسر نہیں ہوں میں قائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں  
 خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں

۱۔ خطِ بنامِ نوابِ کلب علی خاں۔ بعد تسلیمِ معروض ہے حبِ بادشاہِ دہلی نے مجھ کو نوکر رکھا اور خطاب دیا اور  
 خدمتِ تاریخ نگاریِ سلطانیِ ممورِ رنجہ کو تعویض کی تو میں نے ایک غزل طرزِ تارہیرِ نکمیِ مقطع اس کا یہ ہے  
 ”عانتِ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دما۔ ۶۱“ ابنا قطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرنا ہوں خدا کرے کہ حضرت  
 کو پسند آئے سے بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد نہ خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں  
 خط میں ایک قطع بھی لکھا تھا جس میں مقطع بدل دیا ہے۔ قطع حسبِ ذیل ہے۔ ۱۔

در برابرِ کلب علی خاں کے ہوں مقیم  
 ستائے گئے ہر در نہیں ہوں میں  
 بوڑھا ہوا ہوں قابلِ خدمت نہیں اسد  
 خیرات خوارِ محض ہوں نوکر نہیں ہوں میں

ہو جائے مضطرب تو نہیں کچھ خطائے دل      انصاف شرط ہے کہیں راحت بھی پائے دل  
دن رات جو رچ رہا تک اٹھائے دل      کیوں گردشِ ملام سے گھرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

بیکار کیوں سمجھتے ہیں اہل جہاں مجھے      نقصان کیا کسی کو ہے میرے وجود سے  
سہواً نظم نہیں ہوں کہ معنی بدل گئے      یارب مجھے زمانہ مٹاتا ہے کس لئے

لوحِ جہاں پر حرف مکر نہیں ہوں میں

تجویرِ قتلِ جرمِ الفت کے واسطے      ہے ننگِ مدعیِ عدالت کے واسطے  
یہ جو روِ ظلمِ اہلِ محبت کے واسطے      حد چاہیے نزامیِ عقوبت کے واسطے

آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

حُفرتِ حقیر جانتے ہیں کس لئے مجھے      بے آبرو کیا مری تقدیر نے مجھے  
نسبت نہیں ہے کوئی تجاوات سے مجھے      کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے

لعل و زمرہ و زرو گوہر نہیں ہوں میں

اجرامِ چرخ بھی تو نہ فروم ہوں دریغ      اور مجھ سے کہ تنگ ہو وہی جوں کا توں دریغ  
بندہ نواز کس لئے آخر ہے یوں دریغ      رکھتے ہو تم قدمِ مری آنکھوں سے کیوں دریغ

رتے ہیں ہر وہاں سے کمتر نہیں ہوں میں

گردِ دل نے بوسے پاؤں کے کس شوق سے لئے      سر پہ قدمِ تمہارے زمیں تک نہ لئے  
یہ روک لو کہ ہے تو فقط ہے مرے لئے      کرتے ہو مجھ کو منع قدمِ بوسے کے لئے

کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں  
 مرزا کی طرح شغل تمہیں بھی کوئی نہ تھا  
 بے کار بیٹھے بیٹھے زمانہ گزر گیا  
 خوابیدہ بخت شکر ہے بیدار تو ہوا  
 غالب و ظیفہ خواہر ہود شاہ کو دعا  
 وہ دن گئے کہ کہتے تھے لو کہ نہیں ہوں میں

۶۲

تمہیں کبھی زلفیں جو زریب سنبلستان ہو گئیں  
 خار بن کر جلوہ گرد دوز شرکاں ہو گئیں  
 شکلِ نرگس چہنہائے شوخ و قتال ہو گئیں  
 سب کہاں کچھ لار و گل میں نمایاں ہو گئیں  
 خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پہناں ہو گئیں  
 آہ لے عہد جوانی وہ انگلیں اب کہاں  
 تو ہی جب نصرت ہوا پھر کیا ہے عمر جاو داں  
 ولولے ہی دلیں تھے کچھ اور جہنگ تھے جواں  
 یاد تمہیں ہم کو بھی زرگارنگ بزم آرا تیاں  
 لیکن اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں

اس عہدِ دلدادہ و احباب اس تہجد کے ساتھ شائع ہوئی تھی کہ اس ہفتہ میں جو مشاعرہ ہوا احباب مرزا نور الدین بہادر  
 جو کھنوسے تشریف لائے تھے اور نہ پہلے والا تار و لولہ افروز مغل مشاعرہ تھے ایک عزل مرزا علی محمد یعنی میر مشاعرہ  
 اور نزل جناب نجم الدولہ محمد امجد شاہ غلام غالب کی راقم اخبار کے پاس پہنچی۔ جو کہ اردو اخبار میں شائع کر دی گئی۔ غالب  
 منشی حقیر کو بھی اس عزل کے متعلق لکھا ہے۔

”بھائی خدا کے واسطے غزل کی داودینا اگر نیت یہ ہے تو میر و مرزا کیا کہتے تھے اگر وہ رنجہ تھا تو پھر یہ کیا ہے  
 صورت اس کی یہ ہے کہ ایک صاحب شہر اڑکانہ تیموریہ میں سے کھنوسے یہ زمین لائے حضور نے خود بھی غزل کہی اور  
 مجھے بھی حکم دیا سو میں حکم بجالایا اور غزل لکھی۔“



ہو گیا ہر چند پہلو سے جدا نکت جگر دیکھتی آنکھوں ہو اگم یک بیک نور نظر  
دیدہ بے نور واسطے شوق سے اٹھوں میرے قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر  
لیکن آنکھیں روزِ دلیوارِ زنداں ہو گئیں

سیکڑوں قربانی رشک رقابت مر گئے ہیں زبانِ خلق پر دن رات جکے تذکرے  
غیر کا نظارگی ہونا نہ چاہا عشق نے شہرِ رقبوں سے ہیں ناخوش پر نہان ہر  
ہے زلیخا خوشی کہ مجھ ماہ کنعاں ہو گئیں

ہم کو یہ سمجھے ہوئے ہیں اس قدر بے ننگ نام ننگ ہے ان کہتے ہم ہوں اگر ان کے غلام  
خیر اگر چاہا خدا نے پھر تو بن جائے گا کام ان پر یزادوں سے لینے خلد میں ہم انتقام  
قدرتِ حق سے ہی حوریں اگر وال ہو گئیں

دل میں تو بیشک اترتی ہیں یہ چھریاں بیدار آں واحد کے لئے لیکن نہیں ان کو قرار  
تیرہن کر آ رہی ہیں جاری ہیں برق وار وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب کبار  
جو مری کوتاہی قسمت سے شرکاں ہو گئیں

دیدیا ہے اذن درباں نے تو کھا کرتیج و تاب کم ہوا منت سماجت سے مری امر کا غتاب

لے قاعدہ کے عاشق ہمیشہ قہر میں ناخوش رہتے ہیں مگر زلیخا سے مستی رہی یعنی وہ معرکہ ورتوں کو دیکھ کر خوش ہوئی تو  
زلیخا پر طعنہ زن تھیں کہ تو نے ایک غلام سے عشق کیا ہے۔ زلیخا نے انہیں اپنے گھور دیکھا۔ جب وہ انہیں تو ایک ایک لیموں  
پھر ایک ایک جھری سب کے ہاتھ میں دے کر ہلاکت کی کہ جب یوسف انہیں تو جھری سے لیموں کاٹ دیں مگر سب یوسف  
ساتھ آئے تو ان کے حال کو دیکھنے میں اتنی غور ہو گئیں کہ سب نے انتہائی وارفتگی میں بجائے لیموں کاٹنے کے اپنی انگلی  
کاٹ لی تب زلیخا نے کہا کہ تم مجھ پر طعنہ زن تھیں اب جن کا اثر دیکھ لیا۔

ہو گیا ہے سہل گو فعل میں ہونا بایاب      واں گیا بھی میں تو انکی کا یوں کا کیا جواب

یاد تھیں جتنی دعائیں صرف رہاں ہو گئیں

کام اچھا ہے گیا صبر و سکون انجام کار      ورنہ پہونچی تھی یہ نوبت پیر بن ہوتا راتار

دل فغاں کرتا تو پھر ہاتھوں کو کیوں تار تار      بسکرو کا میں نے اور سینے میں ابھریں بار بار

میری آہیں بخیر چاک گر یہاں ہو گئیں

میکرے میں تشنہ لب جو زندہ کام آگیا      چہ خیر آب بقانگ وہ مے اُشام آگیا

جی گیا جو کشتہ شمشیرِ آلام آگیا      جاں فزا ہے باد جس کے ہاتھ میں جام آگیا

سب بیکریں ہاتھ کی گویا رگ جال جا گئیں

اپنے نصب العین ہیں جملہ مذہب بالقوم      نقش ہیں دل پر تمام انکے قوانین و علوم

بچ ہیں اپنی نظر میں لاکھ ہوان سکی دھوم      ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزاء ایماں ہو گئیں

ابتلا میں تو بہت کچھ دل کو تر پاتا ہے رنج      غمزدہ کی جان کو آٹھوں پہر کھاتا ہے رنج

ضبط و استقلال سے آخر تنگ آتا ہے رنج      رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج

مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کڑاں ہو گئیں

دوستوار ورنے کا میرے کیوں راتے ہو مذاق      یہ لہو رو نما بھی ہے آنکھوں کا حسن آفاق

۱۔ مضمون کو مزاحاً غالب میر جہری قریح کے ایک خط میں اس طرح لکھا ہے میری جہری امیج کا وقت ہے جاڑا تو بڑا

۲۔ آنکھیں مٹانے رکھی سوئی ہے دو حرف لکھتا ہوں آگ تاپتا جاتا ہوں آگ میں گرمی بھی مگر ہائے وہ آتش سال

۳۔ کب دو حرفے پلے فوٹارگ پلے میں دوڑ گئی۔ دل تو نا ہو گیا۔

ہے شب بھراں کی تاریکی زیادہ دلوں کو شاق  
 ایک ٹوٹا ٹکھوٹا ہنسنے دو کہے شام فراق  
 میں یہ سمجھوں گا کہ دو شمعیں فروزاں ہو گئیں  
 بزم میں جو ہنسیں تیرا ہے راتیں اسکی ہیں  
 صبحِ نظارہ میں کر دیتا ہے راتیں اسکی ہیں  
 اس بھی وہ خوش نصیب ہے راتیں اسکی ہیں  
 نیند اس کی ہے دماغ اسکے راتیں اسکی ہیں  
 تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں  
 کس غضب کا ہے یہ طوفاں خیز و نا امان  
 اس کی آنکھوں نے تو باندھا ابر باران کا سماں  
 کر دیے اس نے بھی تمزاک کی طرح دریا رواں  
 یوں ہی گریو تار ہا غالب تو اے اہل جہاں  
 دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

وخت ہے اور طاقت رقتا رہی نہیں  
 دامن بقدر غلعت یک خار بھی نہیں  
 ہمساجنوں زدہ کوئی نادار بھی نہیں  
 دیوانگی سے دوش پر زنا رہی نہیں  
 یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں  
 ہو کر غریب و رطہ ترماں ابھر چکے  
 یہ یاں جیتے جی ہے تو سمجھو کہ مر چکے  
 دن اپنے جب کہ شوقِ قہاں گری چکے  
 دل کو بنا زحمت دیدار کر چکے  
 دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں  
 لے میں تجھ سے کرتے ہیں جو کسے راہ لے  
 البتہ تجھ کو پا نہیں سکتے ہیں سست پے

ممکن کبھی ہوئی نہیں کوئی محال تھے ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے

دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

میں اک نحیف و زار ہوں طاقت تو اس پر یہ دل کے ولولے پر شوقِ جاں تاں

حیرت یہ کہہ رہی ہے کباب جا بے کہاں بے عشقِ عمر کٹ نہیں سکتی ہے اویاں

طاقت بقدر لذتِ آزار بھی نہیں

سودائے سر پہ ویرا گندگی ہوشِ وحشت ابھارتی ہے کہ کرنا و خروش

ٹکڑوں ہائے کس سے کھائے جنوں کا جوشِ شوریدگی کے ہاتھ سے سر پہ وبالِ دوش

صحرا میں لے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

دشمن ہی کچھ عناد کو سمجھا کریں شرفِ پھرنے بھی دو جو پھرتے ہیں راتِ سر بکف

لیکن ہمیں جو بغض ہو کچھ بھی تو لو حلفِ گنجائشِ عداوتِ اغیار یک طرف

یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

فریاد میں جو میں نے ہلا دی کبھی زبانِ قائم نہ پھر زمین رہے گی نہ آسمان

آساں میری آہ بہاں سوز کو نہ جانِ ڈرنا لہائے زار سے میرے خدا کو مان

آخر نوائے مرغِ گرفتِ یار بھی نہیں

ہے زخمِ زارِ سینہ کو بیٹاں سے روکشیِ زخمی جگر کو خنجرِ بڑاں سے روکشی

کرتا ہے اس کا تیر نظر جاں سے روکشیِ دل میں ہے یار کی صفِ ترگاں سے روکشی

تالا نڈ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

لیتے ہیں کام اداؤں سے آلاتِ حرب کا      خنجر کی اور تیر کی حاجت نہیں ذرا  
 کرتے ہیں خونِ خلق نہتے ہیں وہ تو کیا      اس سادگی پر کون نہ مر جائے لے خدا  
 لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں  
 مرزا جو بادشاہ تھا اقلیمِ شعر کا      جس کا ہے ملک نظم میں جھنڈا اگڑا ہوا  
 فرزا نہ کوئی ہو گا یہ غالب گمان تھا      دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا  
 دیوانہ گر نہیں ہے تو ہوشیار بھی نہیں

۶۴

رفوگرِ طرحِ شک ہو جلائیے ٹہری پن میں      کہ بیٹھا ہے رفوگر نے مرے زخموں کے دم میں  
 سمجھ لیتا جو ہوتی جھکو کچھ بھی آنکھ اس فن میں      نہیں ہزخم کوئی بخنے کے درخور مرے تن میں  
 ہوا بنے نارِ اشک یا اس رشتہ چشمِ سوزن میں  
 دمِ نظارہ دیوار و درہوں قفِ جبرانی      کہ اچھا رنگ لائی اشکِ چشمِ ترکی طغیانی  
 ان آنکھوں کی بدولت پھر گیا امید پر پانی      ہوئی ہے مانعِ ذوق تماشا خانہ ویرانی  
 کھنسا سیلاب باقی ہے بزرگِ پندہ روزن میں  
 کبھی ابرو کے سرِ مدقے میں قفِ تیغِ برائے ہوں      کبھی زخمی نگا ہو سکِ جراحتِ خوارِ پیکال ہوں  
 و فوہِ سوزن سے جلوہ گاہِ داغِ پہنان ہوں      و دلِ بیتِ خانہ بیدار کاوشِ شہائے شرمال ہوں  
 نیگین نام شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

نہ چھو کیا بلا ہے تیرگی شہائے بجزاں کی  
سیاری مات ہے بختِ سیر کی فردِ عصیان کی  
چمکِ فتنے کی ہے اس میں فیا ہر دشتاں کی  
بیاں کس سے غفلت گستری میرے شہستاں کی

شبِ مہر ہو جو کھدی پندہ بواروں کے روزں میں  
ہنسی یاروں کیا کی اک نصیحتِ جھکو فرمائی  
ز اب وہ جوشِ وحشت ہے ز فطانتِ سیکبائی  
سکوں سا ہو گیا دل کو گیا سامانِ رسوائی  
نکو ہش مانع بے ربطی شورِ جنوں آئی

ہوا ہے خندہ احبابِ بخیرِ جیب و دامن میں  
نہے تقدیرِ آئینہ کر یہ ہوسائے اس کے  
کہاں پیدا دیا شانِ خدا اس کے مقدسے  
یہ حیرت ہے فیا پائی ہے کیا اسکی تکی سے  
پراشتال جو ہر آئینہ میں مثلِ درہ روزں میں

کروں کیا ہمنشینوں سے مری حالتِ خالفت  
محبہ ڈالا ہے نا جنسوں میں کیا کشتِ خالفت  
مراند سب جدا سب مری ملتِ مخالف ہے  
ز عالوں نیکوں یا بدہوں پر محبتِ مخالف ہے  
جو گل ہوں تو ہوں گلن میں جو خس ہوں تو گلشن میں

مقامِ سکھ کیا ہے درد اگر اکھوں نے جھکو  
سکھ روشنی نہ ہوگی اس کے آستانے جھکو  
ذریعے بھی بخشے درد کی برداشت کے مجھ کو  
ہزاروں دل دیئے جوشِ جنوں عشق نے جھکو  
سیر ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

خیالِ گیسوئے پرہیز میں پابندِ حولاں ہوں  
اد پرانی مہرِ رازی طرحِ کیونکر نہ قرباں ہوں  
بتوں کے دامِ کیمیا ہوں اک سیرِ حاسماں ہوں  
آسہ زندانِ تاثیرِ الفت ہائے خواباں ہوں  
حمِ دشتِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

طمانیتِ دلِ اربابِ زریں خاک نہیں خیالِ زر کے سوا اور میں خاک نہیں  
چمٹو رہیں ہے یہاں اور گھر میں خاک نہیں مرنے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں  
سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

محال ہے کہ وہاں نجاتِ نارسا لے جائے کوئی اٹھا کے چمن تک قفسِ مرا لے جائے  
غرض ہے کیا اسے صیاد کی بلا لے جائے مگر غبارِ ہوئے پر ہوا اڑ لے جائے  
وگرنہ تابِ توں بال و پر میں خاک نہیں

ہوئے ہیں فرشِ زمیں گل بہار بے حد ہے کھر ادب سے سر راہِ مردِ خوش قد ہے  
وجودِ عرضِ مرکبِ گلوں سے شاید ہے یہ کس بہشتِ شمائل کی آمد آمد ہے  
کہ غیرِ جلوہ گل رہ گزر میں حناک نہیں

خوفِ کردل مجھے ہوتی تو یوں نہ گھل جاتا سنبھالتا کسی صورت سے اس کو بھلاتا  
مجھے ہی جب نہیں پروا وہ کیوں نہ کھانا بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا  
اثرِ مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

کیا خدا نے نہ مجھ کو کسی سے شرمندہ ہوا کسی کی نہ منت کشی سے شرمندہ  
نہیں ہر کچھ بھی تو ہوں اپنے جی سے شرمندہ ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ  
سوائے حسرتِ تعمیرِ گھر میں خاک نہیں

مدام طالبِ حسن المآب ہیں مے کش      کسی کی یاد میں بلے ارباب میں مے کش  
زمانہ کہتا ہے مست شراب ہیں مے کش      خیال جلوہ گل سے خراب ہیں مے کش

شراب خانہ کی دیوار و در میں خاک نہیں

جو دیکھتے ہیں مضامین تازہ کی آمد      مذاق اڑاتے ہیں مرزا تمام اہل حسد  
کہا جب ہی تو یہ غالب نے ہو کے دق بید      ہمارے شعر ہیں اب صف دل لگی کے اسد  
کھلا کہ فائدہ عرض ہنریں خاک نہیں

۶۶

ہم سے نہ کہتے بار بار کہتے ہو جائے بانی کیوں      اپنے ہی دل کو چھپے زخم بھر دکھائے کیوں  
فرطالم سے خونِ دل اشک میں بہہ نچائے کیوں      دل ہی تو پورہ سنگ و خشت درد سے بھر جائے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اکیس کسی کو فعل کیا ملکِ مد نہیں زمین      سر پہ اٹھائے ہم اسے تو نہ جائیگے کہیں  
اپنا نشانِ شائیں گے صورتِ نقشبانی ہیں      دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستان نہیں

بیٹھے ہیں رہ گزر رہ ہم کوئی ہمیں اٹھائے کیوں

چشمِ بشر میں ہو اگر حسرتِ مہر نیم روز      دیکھ سکے نہ بھر کے جی طلعتِ مہر نیم روز  
تاب کہاں کہ ہو اسے رویتِ مہر نیم روز      جب وہ جلالِ دلفروز صورتِ مہر نیم روز

آپ ہی ہوں نظارہ سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں



خوف سے تیسے روبرو انہیں سکتے ہر وہاں  
 ہو سکتے ہو آئینہ کو بھی ڈال دے تو اگر نگاہ  
 انکو کہاں یہ تاب ہے دیکھیں جو تیری جلوہ گاہ  
 دشمنہ غمرہ جاں ستاں ناوک نا بے پناہ

تیرا ہی عکس رخ بھی سانسے تیرے آئے کیوں

دہر میں شادی و الم اصل میں نول یک ہیں  
 زندگي و محن ہم اصل میں و نول یک ہیں  
 قطرہ آب آب ہم اصل میں و نول یک ہیں  
 قید حیات و بند غم اصل میں و نول یک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اُن سے عذر و کاسادہ پن گئی بواہوس کی شرم  
 باندہ کر آیا تھا کفن رہ گئی بواہوس کی شرم  
 ٹال گیا وہ تیغ زن رہ گئی بواہوس کی شرم  
 حسن اور اس چہرے میں ظن رہ گئی بواہوس کی شرم

اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

ہم کو یہ جن کہ چھٹ جائے راہ صواب پس وضع  
 اسکو یہ ضدادھر سے ہو کچھ تو جواب پاس وضع  
 مانع رکھ و راہ ہے خوف خراب پاس وضع  
 واں وہ غور و غمز و ناریاں یہ جواب پاس وضع

راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلکے کیوں

میں ہوں تلاش یار میں کہتے ہو جس کو گم رہی  
 بک نہ لگاؤ ہمدموں تم نے یہ بات کیا کہی  
 اسکی جفا و جہر سے مجھ کو ہے خوب آگہی  
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا بھی

جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

کم ہوئی مے کشی نہ کچھ دورِ مدام بند ہیں  
 بزم سے اٹھ گئے سبویا کہیں جام بند ہیں  
 عیش و خوشی سے میرزا خاص نہ عام بند ہیں  
 غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں

روئے زار زار کیا سمجھئے ہائے ہائے کیوں

تو نے اشارے سے مجھے کیا یہ بتا دیا کہ یوں صاف جواب دے مجھے میرے سوال کا کہ یوں  
چپ سے چپے کا کام کیا اب تو ذرا ہلکا کر یوں غچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کر یوں  
بوسہ کو چھپتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غمزہ ہوا سا دیکھ لے سینے میں پھر ندل ہے تار و کرشمہ دیکھ کر ہوش اڑ رہا ہے  
تیغ نگہ اگر چلے ہو کے لہو جگر ہے پریش طرز دہری کیجئے کیا کہ بن کہے  
اسکے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

ہم و امید میں ہے کیا کہیں کس طرح جئے حسرت و یاس میں غرض کر کے دن گنوا دیئے  
ہاتھ اٹھا اٹھلے ہم دل سے دعا کیا کئے رات کے وقت ہے ساتھ قریب کو لئے  
اے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

لی ہیں جگر میں چشکیاں طور جفا تو دیکھئے فہ کو جواب کیا دیا طرز ادا تو دیکھئے  
کیسا حجاب اٹھا دیا شرو جفا تو دیکھئے غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے  
سلمانے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

سکتے میں خاص عام ہیں عجب خیال یا رے ہونٹ سینے بھٹے سے ہیں آج تو اہل بزم کے  
حکم سکوت بھی ہیں گو نہ دیا ہوشو نے بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خوش بیٹھئے  
اس کی تو خاموشی میں بھی ہے مدعا کہ یوں

کیا کہیں بزم یار میں بات ہی کچھ بگڑ گئی      مفت میں ہو گیا مرن نہ نظر سنی دل لگی  
دیر تک ہنسی رہی بات بن آئی غیر کی      میں نے کہا کہ بزم ناز چاہئے غیر سے تہی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
اسکو دکھاؤ عشق کا ہوش و خروش کس طرح      لائے زباں پہ حال دل شمع خموش کس طرح  
شوق وہوس کریں بیاں دیدہ و گوشت کس طرح      مجھ سے کہا جو یانے جاتے ہیں ہوش کس طرح  
دیکھ کے میری بچو دی چلنے لگی ہوا کہ یوں

آمد و شد وہاں جو غمی طبع اسی میں شاد غمی      تا دیر بار ہو گئے رد کی یہی مراد غمی  
خاک میں بھی اگر ملا خاک بھی وقف یاد غمی      کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد غمی  
آئینہ دار بن گئی جہرِ نقش پاک یوں

عشق میں صدق ہو اگر اسکا مال ہے وصال      جزو جو کل سے جاملہ ہو گیا ایک لہ کا حال  
وہ سکون و اتحاد کیوں نہ ہو پھر یہ اتصال      گر تیرے دلیں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال

موجِ محیط آب میں ما لے ہے دست و پا کہ یوں  
یوں تو ہیں ہند میں بہت فنِ سخن کے مدعی      ہیں یہ جدائی بند شبنم طرزِ ادبے اور ہی  
حق تو یہی ہے میرا ختم ہوئی سخنوری      جو یہ کہے کہ ریتہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی  
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

## ردیف (و)

(۶۸)

کچھ بات ہو بطر زلامت ہی کیوں ہو عزت ہے ہم کو خواہ اہانت ہی کیوں نہ ہو  
کچھ رکھئے ہم سے دیں کدورت ہی کیوں ہو وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو  
کیئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ممکن نہیں ہے دل میں گزرا بساط کا دل میں وہ شوق و ذوق کہاں ارتباط کا  
اب وہ نہ میں رہا نہ زمانہ نشا کا چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نہ رنگ اختلاف کا  
ہے دل پہ بار نقش محبت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی کا اپنی مجھے مل گیا صلہ ٹوٹا ہے النجائے اعانت کا سلسلہ  
شکوہ کسی کا ہے نہ کسی کا مجھے گلہ ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ  
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

لیں چٹکیاں جگر میں جو مجھ سے کبھی ملا چھیڑا ہمیشہ شکوہ دشمن کا سلسلہ  
کی بات بھی تو وہ کہ دیا جس گول ہلا ہے مجھ کو تجھ سے تذکرہ غیر کا گلا  
ہر چند برسبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

یکسوئی ہو بشر کو میسر یہ ہے حال اس کیلئے غلوت و غلوت کا ایک حال

تنہا بھی ہو تو نفس سے ریتی ہو قیل وقال ہے آدمی بجائے خود اک محتر خیال

ہم انجمن سمجھتے ہیں غلط ہی کیوں نہ ہو

ہم انقلاب سے متاثر ہوں کیا مجال ہرگز نہ لیں ہزار سبق دے جہاں کا حال

وارستگی میں رتبہ وغیرت کار کو خیال ہنگامہ زربونی ہمت ہے انفعال

حاصل نہ کیجئے دہرے عبرت ہی کیوں نہ ہو

آزادگی جہان سے فزائگی نہیں کیا رم ہے اور چیز جو دیوانگی نہیں

دنیا سے بھاگنا کوئی مردانگی نہیں وارستگی بہانہ بے گانگی نہیں

اپنے سے کرنے غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

رکھتا ہے شاہراہ فنا میں قدم کوئی ہوتا ہے محو دل سے خیالِ عدم کوئی

اس فکرِ جاں گداز سے چھٹتے ہیں ہم کوئی ملتے فوت و صفت، ہستی کا غم کوئی

عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو

کرتے پھر ی رقیب چناں و چینیں آسہ جاتے ہیں اسکے کوچے سے مرزا کہیں آسہ

دیکھیں گے آپ قبر ہماری وہیں آسہ اس فتنہ نو کے دسے اب اٹھتے نہیں آسہ

اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

ستایا تو نہیں میں نے کسی مرغِ نوازن کو مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے دیکھیں اپنے دشمن کو

فغان کرتا ہوں میں جب یاد کرتا ہوں نشین کو      قفس میں مگر اچھا بھی نہیں جانیں میسے شیون کو

مرا ہونا برا کیا ہے تو اسنجہاں گلشن کو

یہ ماننا غیر صورت اشنا اس کا نہ حرم ہے      مگر یہ روسیہ اس کے تجس میں تو ہر دم ہے

وجودِ غیر جب تک ہے تو مجھ کو کچھ نہ کچھ غم ہے      نہیں مگر ہمدی آساں ہو یہ شک کیا کم ہے

ندی ہوتی فلا یا آرزوے دوست دشمن کو

بھرا یا بجیرہ گردل بھی ظالم میہی حالت پر      انڑ والا نہ اس منظر نے بھی تیری طبیعت پر

ہنسی آتی ہے مجھ کو تیرے دلوئے زخمت پر      نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جرات پر

کیا سینے میں جسے خونچکاں مژگان سوزن کو

ہوئی ہے کیا بلا دیوانگی عشق پر پوش میں      کیا لائے سکون مطلق تہیں قلبِ شوش میں

جنوں کی حرکتیں قائم ہو گئیں حالتِ بخش میں      خدا شرمائے ہاتھوں کو کر کے تہیں کشتاں میں

مسمی میرے گہ ہاں کو کبھی جاناں کے دامن کو

ہم اپنا غرقِ خوں ہونا بجا آساں سمجھتے ہیں      رواں ہونا گلے پر تیغ کا آساں سمجھتے ہیں

نکلتا جانبِ مقتل ترا آساں سمجھتے ہیں      ابھی ہم قتل گہر کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں

نہیں دیکھا شننا و جوئے خوں میں تیرے توسن کو

رہا دستور آہن سے سناں و تیر بنے کا      ہمیشہ مادہ اس میں رہا شمشیر بنے کا

زمانہ اب ہے اس کے لائق تو قبر بنے کا      ہوا چرچا جو ہرے پاؤں کی زنجیر بنے کا

کیا میناب کال میں جنبشِ جوہر ہے آہن کو

مجھے کیا اہل سے ہرگز گھبے یا گھر کے کھل جائے  
 دُرِ خوش آب پانی کی جگہ یا روزِ برسات  
 سینہ سختی سمجھتا ہوں اگر کالی گھٹا چھائے  
 خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار اُرائے  
 سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابلی سے برقِ خرمن کو

زہے قسمت کہ اسکے سامنے مثالِ جانناں ہے  
 بتوں کو جان کر سگانِ کعبہ دل کو قرباں ہے  
 اگر دیکھیں حقیقت میں تو وہ بکا مسلمان ہے  
 وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے  
 مرے بت خانہ میں تو کبے میں گاڑو برہمن کو

پھر یا سرِ بخت شوقِ اجل نے چار سو مجھ کو  
 لے پھرتی تھی در درِ جاں دہی کی آرزو مجھ کو  
 رہی جلا دہی کی زندگی بھر جستجو مجھ کو  
 شہادتِ بختی مری قسمت میں جو دی تھی جو مجھ کو  
 جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

جو ہونا مالِ مٹھی نہیں دیکھو نگرِ خاک پر سوتا  
 زرو گوہر کے ہونے کس طرح ٹھنڈے بگر سوتا  
 متاعِ رفتہ رہ جاتی تو پھر کیا بے خطر سوتا  
 نہ لٹنا دن کو تو کب ات کو یوں بے خبر سوتا  
 رہا کھٹکانہ چوری کا دام دیتا ہوں رہزن کو

مضامین کے خزینے بہتے ہیں سینے میں شاعر کے  
 تہزینہ دار و مالک ہیں سمنور ان ذخائر کے  
 گہر کی قدر کیا ہے سامنے الفاظِ نادر کے  
 سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے  
 جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

درِ اقدس کا اک بان ہے فغفور ہیں غالب  
 سکند کو بے خراسان بوسی ہیں غالب  
 اسی دروازہ پر کھٹا ہے مرزا بھی جیس غالب  
 مرے شاہِ سلیمان جاہ سے نسبت نہیں غالب  
 فریبوں و جمل و بخت و دراب و بہن کو

سکر سنانی سن ہوئے اس خستہ تن کے پانو  
جاتا کہاں کہ ہو گئے ایک ایک من کے پانو  
کیا جانتا تھا وہ نہیں جھوٹے سخن کے پانو  
دی سادگی سے جان پڑوں کو بہن کے پانو  
بیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

جی میں ہے پوجئے بت نازک بدن کے پانو  
جیسے بھاری پوجتے ہیں برہمن کے پانو  
ہاتھ انیس کس طرح گراس پرفتن کے پانو  
دھوتا ہوں میں جو پیئے کو اس سیم تن کے پانو  
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

کہتے تھے اپنے نفس کو ہم ناز لب یہہ  
بچتے تھے اس کے سایہ سے گو یا بلا ہے یہہ  
اتارہ اب ہمارے لئے ہو گیا ہے یہہ  
بھاگے تھے ہم بہت سوا ب اکلی نزل ہے یہہ  
ہو کر امیر دانتے ہیں راہ سزن کے پانو

سارا بدن ہے فرط جراثیم سے چورچو  
عاجز ہوں دواؤ دوش سے تو کیا قصور  
جراثیم کچھ علاج تو ان کا بھی کر ضرور  
مریم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور  
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

مدچاک لے صورتِ مدبر بگ چار بگ  
محکم میں تھا نہ کچھ بھی غم برق و تگرگ  
پھر ہو چلا ہے قبر میں وحشت کا ساز و برگ  
اللہ کے ذوقِ دشتِ نور دی کہ بعد مرگ  
ہٹتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو



گلبن کی شاخ شاخ ہوئی جام گل بکھن      ہیں قمریوں کی تاک میں سب ہر وصف نصیف  
 کس کس کی جان دیکھے امسال ہو تلخ      بے خوشی گل بہار میں یاں تنگ ہر طرف  
 اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ جن کے پائو  
 ناز و نزاکت ایسی بھی دیکھی سنی نہیں      رفتار کے خیال سے تھکتا ہے وہ حسین  
 ظاہر ہیں سب تکان کے آثارِ ہم نشین      شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں  
 دکتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پائو  
 ایسا سخن شناس تو شاید سنا نہ ہو      بڑھ کر سخنِ ظفر کا جوب چاٹنا نہ ہو  
 مرزا یقین کیوں مجھے اس قول کا نہ ہو      غالب مرے کلام میں کیوں کر مرزا نہ ہو  
 بیٹا ہوں دھوکے خور و شیریں سخن کے پائو

یہ قدم رنجِ پاکیا کوئی کم ہے، ہم کو      ان کا لانا ہی سرِ بزمِ کرم ہے، ہم کو  
 خاکِ لوسی کا عجب شوقِ تم ہے، ہم کو      واں پہنچ کر جو غش آتا ہے، ہم کو  
 صدرِ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے، ہم کو  
 سر میں سودائے چمن ہے نہ ہوائے گلشن      تیرے در سے ہیں پائو اٹھانا بھی کٹھن  
 لاغری وہ ہے کہ اک بال ہیں گویا ہر تن      ضعف سے نقش پئے مورے طوقِ گردن  
 تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ دم ہے، ہم کو

آج ہمدرد زمانے میں کہاں پیدا ہے  
ایک کا ایک کو ہو درد تو بے جا کیا ہے  
غم سے جو واسطہ میرا ہے وہی دل کا ہے  
دل کو میں اور مجھے دل نحو و فار کھتا ہے  
کس قدر ذوق گرفتاری ہم ہے ہم کو

وائے غفلت کہ نہیں اتنی خبر بھی اب تو  
سامنے کون ہے اور آپ نے دیکھا کس کو  
ہم سے اب یدہ و دانستہ ہو غماض ہو جو  
جان کر کیجئے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو  
یہ نگاہ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رہنے دیں دوست اسی طرح ہیں گوشہ نشین  
سیر گزار سے دل اور بھی ہو گا غمگیں  
کھائیے زخم جگر پر یہ ہمیں تاب نہیں  
ریشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزین  
نالہ مرغ چمن تیغ دودم ہے ہم کو

صاف ظاہر ہے کہ وعدہ تھا مگر صاف نہ تھا  
وقت اصرار کھلا آکے نتیجہ اس کا  
ایسی قسموں کا بھروسہ بھی کیونکر ہوتا  
سراڑانے کے جو وعدے کو مکر چاہا  
بنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

بے سبب شک رواں کا تو نہیں باز رہتا  
عین جو ہے یہ ان کا کہ ہوا آنکھیں خونبار  
نہ ہو روئیں تو مرقاں پر کہاں سے بہا  
دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچا

پاس بے رونقی دیدہ اہم ہے ہم کو  
داخل شکوہ سمجھتے ہو جو خاموشی کو  
حال کیا ہو جو کبھی نالہ پُر درد سنو  
تم وہ نازک کہ خاموشی کو فضاں کہتے ہو  
کیا کریں چین کسی طرح نہ جب لینے دو

ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو  
 عقل حیران ہے کس وجہ سے چوڑی دھلی  
 یک بیک چوڑی کیوں لغتِ راحت گھر کی  
 کچھ تو ہے جس لئے طے کی ہے مسافت اتنی  
 نکھٹو آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی  
 ہوسیں سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو  
 جب چلے گھر سے تو تھی دلیس بیابان و دی لہر  
 قصد ہے دور کا مانع جو نہ ہو گردشِ دہر  
 بیٹھ رہنا ہیں اور ترک سفر ہے اک قبر  
 مقطع سلسلہ شوق نہیں ہے برہنہ شہر  
 عزم سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو  
 آپ کی طرح ہے مرزا بھی کرم کا طالب  
 دل کھنچا جاتا ہے اربابِ کرم کی جانب  
 وجہ نقل و حرکت کیا کہوں مرزا صاحب  
 لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب  
 جادہ رہ کر شش کافِ کرم ہے ہم کو

۷۲

کیا قابلِ خطاب وہی روسیہ ہو  
 مجھ پر نہ بھول کر بھی کرم کی نگاہ ہو  
 چاہو اسی کو دل میں اگر اس کی چاہ ہو  
 تم لے جاؤ تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو  
 مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گتہ ہو

سے غالب صاحبِ نواب علانی کو ایک خط میں لکھا "اشعار تازہ مانگتے ہو کہیں سے لاؤں۔ عاشقانہ اشعار سے  
 مجھ کو وہ بعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گوشت کا بھٹا تھا بھی کرتا تھا فطرت پاتا تھا۔ فطرت موقوف ہوئی مزرع  
 زغرل دمیر، ہزل و بجو میرا آئین نہیں پھر کہو کیا نکھوں۔ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ تلنے کو (بانی ص ۳۱ پر)

الزام رکھ کے غیر پہ کیا صاف ہو گئے      گویا یہ خون ہی نہیں ذمہ جناب کے  
 فرماتے ہو کہ قتل کیا تجھ کو غیر نے      بچتے نہیں مواخذہ روز حشر سے  
 قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

جس طرح قتل و خون میرا جس بے ہراس میں کیا وہ بھگلیوں ہی دتسن جان اناس ہیں  
کیا یوں ہی ان کے خیمتہ بھی وقفہ ملیں کیا وہ بھی بے گنہ کش حق ناشناس ہیں  
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

مخل تمام شوقِ ستی میں ہے بے قرار  
تکتے ہیں غیر بھی نگہ بد سے بار بار  
یہ رشک کس طے نہ کرے مجھ کو دلِ فگار  
ابھرا ہوا نقابہ میں ہے ان کے ایک تار  
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

رکتانہ میکرہ سے تو رکتا جگہ کی قید      آزاد کے لئے نہیں زیبا جگہ کی قید  
 وارستگی بہا ہے نوبے جا جگہ کی قید      جب میکرہ چھٹا تو پہرا ب کیا جگہ کی قید  
 مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

باقی ۹۹ کا ۔ - ملکا ہوں اگر اطراف و جوانب سے امتحا جاتے ہیں اسلئے یا جگہ میں باور کرنا اور مطابقت  
واقعہ سمجھنا مقہرہ دیکھنے کو دل بہت پیار تھا اور تمنا اور حقوق اس پر بہت کچھ ہیں اور کاش اپنے والد ماجد کیساتھ  
پلے آتے اور مجھ کو کچھ ملے نہ تھا تو تم کو غیر سے جو رقم دے رہا ہے مجھ کو بھی دے دیتے ہو تو کیا نہیں ہے۔  
اسے حال میں اس طرح لکھ لوں گا کہ اس کو خود رسد و خاتواں مساوی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جبکہ جہاں فریادوں  
کے ساتھ مرگ رہے کا اظہار ہے وہاں چھٹ گناہ مسجد میں اور خاتواں میں بھی لکھ کر لی ہیں میں کوئی عذر نہیں  
ہے یعنی یہ مقامات اس متعل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی مسجد کے چھٹے کے بعد ہی سے یہ انکار نہیں ہے اور  
خزائن میں کی تصریح نہ کرنا میں مقتضات ملاحت ہے۔ مرزا غالب شوخی برتے سے کبھی نہیں جو کہ یعنی مسجد میں  
۱۔ اتنا حالت عزت میں مگر غالب صاحب ان سے کس کو مساوی کچھ لیا ہے۔ ۱۲

ہر چیز باغِ فلد کی ہے منتخب درست      تور و قصور و شہدانا روعنب درست  
مشہور ہے کہ ہے وہ مقامِ طربِ رست      سنتے ہیں جو بہشت کی قلوبِ سب دست  
لیکن خدا کرے وہ ترا جلوہ گاہ ہو  
سُونا نہ ہو گا دیس اگر ہم نہ ہوں کہیں      ذاتی نہ کوئی گھر ہے نہ گھر کی کہیں زمین  
مرزا وجود شاہ ہے رونقِ فنا دیں      غالب بھی گرنہ ہو تو کچھ ایسا فر نہیں  
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۷۳

تمہیں نہ ضبط سے جب کام ہو تو کیونکر ہو      تمہیں نہ فرصتِ تدبیر ہو تو کیونکر ہو  
اب اس سے حضرت دل بات ہو تو کیونکر ہو      گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو  
کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو  
حصولِ وصلت و دیدار تو ہے امرِ مال      فقط ہے باعثِ تسکینِ تصورِ مثال  
امید و یاس کو بچھلے آرزو کا مال      ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال  
کہ گرنہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو  
کبھی خیال کا اظہار مدعا کیجئے      کبھی یہ وہم کہ ہر گز نہ یہ خطا کیجئے  
کہاں تک اپنے مقاصد کا التوا کیجئے      ادب ہے اور یہی کش مکش تو کیا کیجئے  
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

تمہارا دل ہے کر رشک و حسد کا بغینہ      بھرا ہی رہتا ہے بغض و نفاق سے سینہ  
یہاں تک اپنے مقابل سے تمہیں کینہ      الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ  
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

وہ رشکِ ہر رہا رات بھر تو جلوہ نما      نمود ہونے نہ پائی سحر کہ چیل نکلا  
میری نگاہ میں اندھیر کیوں نہ چھل جاتا      جسے نصیب ہو روز سیاہ میل سا  
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

یہ دُشمن ہے جس نے ہم کو لوسا      تو تم نے غایتِ نخت سے سر کو ٹھکرایا  
نہ شرم کچھ تمہیں بندوں کی ہے نہ خوف خدا      تمہیں کہو کہ گزارہ صنم پرستوں کا  
بتوں کی ہو جو تمہاری سی خو تو کیونکر ہو

کریں گے حضرت دل خاکِ تمہاری قد      ہونی نہ کچھ بھی ہماری سوائے خواری قد  
انہی کے ہوں وہاں ہم جہاں ہماری قد      ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قد  
ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

ہمیں تو آیہ قرآن تھا جو مضمونِ وفا      بجا ہے ہم نے جو پڑھ کر کہا ہے آمنا  
وفا ضرور کریں گے وہ وعدہ فردا      غلط نہ تھا ہمیں خط پر گسانِ سلی کا  
نہ مانے دیدہ و دیدار ہو تو کیونکر ہو

سکوں سے کام نہ لوں غطاب میں تو قصو      مگر ہوں غبط میں اس فطر اسے مغزو  
زمانہ بھر میں نہ مرزا سا پائے گا صبور      مجھے جنوں نہیں غالب نے بقولِ حضو  
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو      (لے ماشیہ ص ۳۱۱)

جوتاب فسطح غم ہوا شک لکھو کس کیوں ہو      کس دل کی بیٹابی کا در پرہ بیاں کیوں ہو  
جو ہو در آشنا تو شکوہ در نہاں کیوں ہو      کس کو دے کے دل کوئی نوا سنج خفاں کیوں ہو  
نہ ہو جب ل ہی پہلو میں تو پھر نہ میں باں کیوں ہو

وہ ہر سلسلہ توڑیں تو تم کب تک سے جوڑیں      رہیں ہم بخود غارہ کہاں تک جب منہ موڑیں  
خفا وہ ہیں بس ہوں ہم زرتہ تنگیں کو کیوں توڑیں      وہ اپنی خود چھوڑینگے ہم اپنی غم کو چھوڑیں  
سبک دہنے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

چھپا رکھا تھا ہم نے اپنے دل میں راز الفت کو      نہ کی آف جبر استقلال سے جمیلا ہر الفت کو

حاشیہ ۱۳۱ کا :- عرل اضر لو کے ساتھ دلی کے اندوہنا میں جھپی جب قلعہ معنی میں مشاہدہ ہوا تو اس میں نیرال غائب صاحبِ طبع نے نزل کیلئے طرہٴ عینہ بادشاہ ظفر اکبر تھے۔ عطف میں مانتا بادشاہ کے طرہٴ مصرع کو اس طرح نظم کیا ہے مجھے جنوں نہیں غائب ہے بقول حفصہ :- فراقِ یار میں سکیں ہو تو کیونکر ہو۔

لے مرزا غالب نے خانقاہی تہہ کو نکھا کہ میں نے ان دلوں و غریبوں کو بھی ہے۔ ایک تو دنیادہ ہو سو وہ آپ کے پاس بھیج چکا ہوں۔ دوسری غزلِ نرہاں کیوں ہو گماں کیوں ہو اب بھیجتا ہوں۔ نیز دوسرے خط میں انھیں کو کھلا :-

تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ براہِ کنی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس اگر کسی بعد در پردل آیا ہے تو شکایت کی گنجائش نہیں ہے بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستانہ و غمِ افرایش ہے بقول غالب :-

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنج خفاں کیوں ہو      نہ ہو جب دل ہی سیہ میں تو پھر نہ میں باں کیوں ہو  
ہے یہ شعر ہے

بہ فتہ آدلی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے      ہوئے تم دوست جس کے دشمن اسکا آسمان کیوں ہو

خبر کیا تھی ہمارے دردِ پہنائی کی خلقت کو      کیا غم خوانے رسوا لگے آگ اس محبت کو  
نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا راز داں کیوں ہو

نہ کرنے لے ہمیں وحشت میں سجدہ اپنی چوکت کا      پہاڑوں تک کرے گارہری سودائے سراپنا  
ہمیں ہے کچھ نہ کچھ تو چارہ جونہی جنوں کرنا      وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر بھوڑنا ٹھہرا  
تو پھولے سنگ ل تیرا ہی سنگ آستان کیوں ہو

نکل و سرور یا حسین کا مفعول ذکر کر ہم دم      کڑا دل کسے کسبِ لالت مجھ سے کہہ کر ہمد  
یہ ہے پوچھنے پر تو نے تھا ماکوں بر ہمد      قفس میں مجھ سے رو دا دین کہتے نہ ڈر ہمد  
گری ہے بس پہ کل بجلی وہ میرا آئینا کیوں ہو

نظر بندی یہ کیسی ہے معا کیا ہے سمجھاؤ      طبیعت کو عجب الجھن ہے اگتھی کو سلجھاؤ  
اگر پردہ نہیں تیر نظر تو سب سے آؤ      یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں لیکن یہ بتلاؤ  
اگر دل میں نہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

کچھ ایسا ہی ہر انسان کی طبیعت کا اعضا ہے      کہ یہ اپنی خطا کو غیر کے سر ڈال دیتا ہے  
ہمیں ٹھہرے گنہگاروں میں یہ انصاف اچھا ہے      غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو تو کس کا ہے  
نہ جھینچو گرم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ رُخ کا آئینہ دنیا کی حیرانی کو کیا کم ہے      پریشان رُخ عالم کی پریشانی کو کیا کم ہے  
نگاہ تیرا بنا زوں کی قربانی کو کیا کم ہے      یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسمان کہیں ہو



عنایت تم نے کی جس پر اسی کا ناک میں دم ہے      ہوئے غمخوار جس غمگیں کے تم وہ طبع غم ہے  
تمہاری مہربانی میں بھی جلا دی کا عالم ہے      یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے  
ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا اعمال کیوں ہو

مصیبت رشک کی ظلم عدو دن رات سہتے ہیں      تمہاری مہربانی سے پریشاں حال بہتے ہیں  
ہنسی سوجھی ہو تمکو اشک یا لکھو سہتے ہیں      یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

ابھی آئے ابھی جلتے ہو جانا کس کو کہتے ہیں      یہ آنا ہے تمہارا تو نہ آنا کس کو کہتے ہیں  
کراں سمجھا ہے اس کو تو جلا نا کس کو کہتے ہیں      یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں  
عدو کے ہوئے جب تم تو میرا امتحان کیوں ہو

جو کہتا تھا بری ہے غیر کے گھر محفل آرائی      تو ہنس کر مالتے تھے جھکو ٹھیراتے تھے سودائی  
لگے اب بحث بھی کرنے جتا کر اپنی دانائی      کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں سوائی  
بجائتے ہو پرچ کہتے ہو پھر کہنا کہ ہاں کیوں ہو

چلا جادو و جب مہر کا اسکے روبرو غالب      کرے گی کیا اثر پھر خاک تیری گفتگو غالب  
برہمزم اس ہے بے فائدہ کیوں جد و غالب      نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں تو غالب  
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہر ہاں کیوں ہو

## رولیف (ری)

(۷۵)

سب ریتوں کے ساتھ مراعات چاہیئے آپس میں اتحاد ہو وہ بات چاہیئے  
 زندگی وزاہری میں مساوات چاہیئے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

رُخ کے قریب زلف کی ظلمات چاہیئے دن سے ملی جلی ہوئی یہ رات چاہیئے  
 ہرنے کا اس کی ضد ہی سے اثبات چاہیئے مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیئے  
 بھوں پاس آنکھ قبلہ حاجات چاہیئے

مصروف آپ مشق جفا میں نئے عمر بھر مطلق نہ تھی کسی دل مظلوم کی خبر  
 بیٹھے ہیں اب تو ہاتھوں تلے ہوئے بگر عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک شخص پر

آخر تَم کی کچھ تو مکافات چاہیئے  
 جرات تو دیکھ اس دل کو تارہ دست کی اس نامراد نے کبھی ہمت نہ پست کی  
 اب غم ہے نیست کا نہ خوشی اس کو ہست کی وہ دادا نے فلک دلِ حُسن پرست کی

ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے  
 صورت کو ان کی روح جب اپنی ترس گئی تدبیر کارگر نہ ہوئی کوئی دید کی

اس سے زیادہ شکلِ رسائی کوئی نہ تھی      یکے ہیں مہرِ فوں کے لئے ہم مصدق

تقریب کچھ تو ہر ملاقات چاہیئے

یہ لوٹتا ہے ثروت و اقبال و جاہ کو      کرتا ہوں غافل اس سے دلِ عشق خواہ کو  
سمجھا نہیں ثواب کبھی اس گناہ کو      سے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو

اک گونہ بخودی مجھے دن رات چاہیئے

بے کار شے ہیں ہم وہ محرک اگر نہ ہو ق      مژرایہ راز وہ ہے جو پاتے ہیں راز جو  
ہستی کا سب ظہور عدم سے ہے جان لو      نشو و نما ہے اصل سے غالب فرس کو

فاموشی ہی سے نکلے جو بات چاہیئے

ہر باغ کی ہے باغِ جہاں میں فضا جدا      ہر گلستاں نے پائی ہے آبِ ہوا جدا  
ہر گل کی بو جدا ہے روش اور ادا جدا      ہے رنگ لار و گل و نسیم جدا جدا

نہرِ رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

سر میں اگر خودی ہے نہ نام بے خودی      خود میں ہے تو نہ کر ہو سِ خام بے خودی  
کر سجدہ شکر کا جو طے جام بے خودی      سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

قائم ہو ایک حال پہ کس طرح آدمی      کرنی ہے راہ طے اسے جذبِ سلوک کی  
ہر فعل کی ہے حالتِ موجودہ مقتضی      سر پہ ہے خم پر چاہیئے ہنگام بے خودی

رو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے

خالی نہ ہو حقیقت عرفاں سے کوئی بات      انسان حرف حرف سے پیدا کرے نکات  
 نظارہ صفات سے ہو جائے خود ذات      یعنی بحسب گردشِ پیمانہ صفات  
 عارف ہمیشہ مست ہے ذات چاہئے

(۷۶)

ذرا سی جان تن میں، فدا کرنے کو ہوں وہ بھی      رگوں میں جو ہو تھا ہے سرشک لالہ رگوں وہ بھی  
 جگر رکھتا تھا لیکن اب با حالِ زبوں وہ بھی      بساطِ غریب میں تھا ایک ل اک قطرہ خوں وہ بھی

سورہا ہے بانڈاز چکیدن سمرگوں وہ بھی

یہ کیا کم مہربانی ہے کہ ٹالابات کو اس نے      وگرنہ مفت میں لینے کے دینے پڑ گئے ہوتے  
 خدا نا خواستہ دل سے نہ وہ روٹھنا نہ ہم روٹھے      ہے اس شہر سے آزر وہ ہم چندے تکلف سے

تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

نکالے کوئے اربانِ دل آخر مقدر نے      کہ ہم ہوں منتظرِ پیکِ اجل کی آمد آمد کے  
 طبیعت کو ذرا الجھاؤ سا ہے اس تصور سے      خیال مرگ کیا تسکین دل آزر وہ کو بخشے

مے دامِ تنہا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

سرشکِ خوں بہانے سے تو تھا یہ دعا، ہم دم      کہ دل کی آگ اس پانی سے کم ہو گی ذرا ہم دم  
 مگر اس سے تو سوزِ قلبِ دونوں ہو گیا ہم دم      نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہم دم

کہ ہو گا باعثِ افراتیشِ دردِ دروں وہ بھی

بجائے زور بازو پر جہاں تک اپنے اتراؤ  
کرو تعریف اپنی سرخرو اس کو نہ ٹھہراؤ  
میر مقتل زیادہ اس کے جوہر کو نہ چمکاؤ  
نہ اتنا بریش تیغ جہاں پر ناز فرماؤ

مے دریائے بیتابی میں ہر اک موج خوں وہ بھی

توقع کیا سوال اس سے اگر اک دور کا کیجئے  
مناسب ہے کہ اشک حسرت و ارباں پیایجئے  
سبھو خالی دکھا تپے جو عرض مدعا کیجئے  
سے عشرت کی خواہش ساقی گڑوں پر کیا کیجئے

لے بیٹھا ہے اک دو چار جام واز گونہ بھی

امید و بیم میں مرزا ہوا کہ مدت کو سرگرداں  
نہیں بننے میں تا اس سے ملے کا کوئی سامان  
کسی صورت پر شکل دیکھنے ہوتی بھی ہر آساں  
مے دولیں ہو غالب شوق وصل شکوہ ہجر  
خلا وہ دن کہے جو اس سو میں یہ بھی کہوں وہ بھی

نکالے گی نہ چکر سے یہیں گردش زمانے کی  
یہ گردش جہنم بھی ہر نہایت دل لگانے کی  
زین پر لب کوئی صورت نہیں آرام پانے کی  
غم دنیا سے گری پائی بھی فرصت نہ بٹھانے کی  
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

اسے اپنی پیش کا حال کچھ کہہ تو دیا یارب  
مگر خط کو مہر وہ بڑھ بھی لے امیر کیا یارب  
جلا ہی دے کہ سوز دل تو ظاہر ہو ذرا یارب  
کھلے کا کس طرح مضمون مے مکتوب کیا یارب  
قسم کھائی ہے اس کا فرے کا فذ کے ہلائے کی

اگر ہے آہ آتشبار نالہ آتش افشاں ہے      نہیں چارہ کہ عالم آشکارا زہنیاں ہے  
دباؤں یہ دیکھتی آگ کو نکر عقل جہاں ہے      لیٹنا پر نیاں میں شعلہ آتش کا آساں ہے  
دے مشکل ہے حکمت دل میں سو غم چھپانے کی

کوئی بے کار ان کا جانب گلزار جانا تھا      گلستاں کو مگر اس رنگ سے مقتل بنانا تھا  
گلوں کو بھی نوپنے زخم خوردوں میں ملنا تھا      انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا  
اٹھے تھے سیر گل کو دیکھنا شوخی مہمان کی

مقدربہ میں تھا کچھ نتیجہ سے افسوس سزا پر مرنا      بد انجامی تھی اپنی خوبی آغا ز پر مرنا  
مناسب تو نہ تھا اس ظاہری انداز پر مرنا      ہماری سادگی تھی السفات ناز پر مرنا  
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

غم دور اس کے شکووں حقیقت کش گئی اپنی      طبیعت کی وہ قوت اور وہ جولانی غلط گئی  
حسینوں کی اٹھائے بات کس کو تاج اتنی      لکڑ کو پ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی  
میری طاقت کہ ضامن تھی تہوں کے ناز اٹھانے کی

رہنے میں نہیں سچی محبت کا نشاں غالب      جنھیں کہتے ہیں فیضِ مُستِ اب میں کہا غالب  
بیانِ حال میں قاصر تر از کی زباں غالب      کہوں کیا خوبی اوضاعِ ابتداء زماں غالب  
بدی کی اسنے جس سے ہنسنے کی تھی بارہا نیکی

زنداں سے بھی زیادہ برا یہ مکان ہے      اک قبیہ میں پڑے ہیں معیبت میں جان ہے  
یہاں نقطہ خیال زمیں کا نشان ہے      کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے  
جس میں کہ ایک بیضہ مور آسمان ہے

سیارے گھومتے ہیں فلک پر تیسے لئے      اسباب اور کچھ بھی نہیں ان کی سیر کے  
چکر دیئے ہیں چرخ کو تیری تلاش نے      ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے  
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

بے چارہ دل حلاوت دنیا سے بہ تنگ      ہو کیوں نہ چور چور کہ کھایا ہے سخت سنگ  
اس سنگ ن کے وہم سے ہومی عقل رنگ      حالانکہ ہے یہ سیلی خارا سے لار رنگ  
غافل کو میرے شیشے پر سے کاگان ہے

اپنا تو دل تھا آگ سے گویا بھرا ہوا      کرتا قیام پھر وہ اس آتش کدے میں کیا  
غالی تھا سوز و عشق سے ہاں دل قریب کا      کی اس نے گرم سینہ اہل ہوس میں جا  
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

کچھ بات جھک کے کان میں کہنا بہانہ تھا      آخر کوئی سبب بھی تھا دامن کی آڑ کا  
اب تم دھناتی سے تو نہ جھٹلاؤ بر ملا      کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا  
بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

آنکھیں لگی ہیں جانبِ درانتظار میں تصویرِ سافحوش ہے شوقِ نگار میں  
آیا ہے گشتِ کر کے ابھی قارزار میں بیٹھا ہے جو کہ سایہ دیوار یار میں

فرماں روا کے کشورِ ہندوستان ہے  
غم نے لہو پلانے کا اچھا صلا دیا اک داغِ جاں گدازِ جگر پر لگا دیا  
اس داغ نے تمام جگر کو جلا دیا ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا  
کس سے کہوں کہ داغِ جگر کا نشان ہے

اس پر جو ڈالتے نہیں وہ قہر کی نظر ظاہر ہوا نہیں ہے بھروسہ رقیب پر  
مڑنا کا بخت برسرِ یاری ہے سر بر سر ہے بارے اعتماد و فاداری اس قدر  
غائب ہم اس میں خوش ہیں کہ ناہربان ہے



یا تو میں کرتا تھا غمتِ آہ و زاری ہائے  
اور تو کرتا تھا کچھ غمِ گساری ہائے  
یادِ دمِ آخر جتنی شرطِ یاری ہائے  
درستِ میرے تھے کچھ کو بے قرار ہائے  
کیا ہوئی ظالم تری نفلتِ شعاری ہائے

دل کا دل ہی میں رہا کچھ بھی نہ نکلا حوصلہ  
پست ثابت ہو گیا الفت میں تیرا حوصلہ  
منہ چھپا یا مجھ سے بس اتنا ہی مال کیا حوصلہ  
تیرے دل میں گزرتا تھا آشوبِ غم کا حوصلہ  
تو نے بھر کیوں کی تھی میری غمِ گساری ہائے



عہد تجھ سے زندگی بھر کے لئے تو لیا      کیا خبر تھی زندگی نکلے گی تیری بے وفا  
 سامنے آیا مری تقدیر کا کھٹا ہوا      عمر بھر کا تو نے پیمان وفا باندھا تو کیا  
 عمر کو بھی تو نہیں تھی پاداری ہائے

اُنٹھ چکے ہیں جب کہ سامان بقائے زندگی      ہو پھر اس سے کیا خوشی کیا دل کو بھائے زندگی  
 کون مر کر جسے چوٹھے میں جلے زندگی      زہر لگتی ہے مجھے اب وہوئے زندگی  
 یعنی تجھ سے تھی اسے ناساز گاری ہائے

ناز کی سے یاد مکتا تھا تر از رخ پھول سا      صورتِ برگ خزاں یا اب ہے مرجھا یا ہوا  
 کس ہونے لے گلِ تر تجھ کو پتہ مردہ کیا      گلِ فشانے ہائے ناز جلوہ کو کیا ہو گیا  
 خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے

تجھ کو رہنا تھا ہمارے دیدہ نمناک میں      یا مناسب تھا بنانا گھر دل صد چاک میں  
 خوشن داری سے تیری آگیا دمِ ناک میں      شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں  
 ختم ہے الفت کی تجھ پر پڑہ داری ہائے ہائے

کامیابی اب کہاں ہے بات ہی اے دل گئی      وہ بہارِ عاشقی وہ رونقِ مفضل گئی  
 عہد لینے کی وہ ساری سچی لا حاصل گئی      خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی  
 اُنٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

منہ چھپا یا خاک میں کیوں آخر کیا خیال      کیا کسی پر ہو گیا ظاہر تے دل کا خیال  
 جب کہ رسوائی کا تھا ظالم تجھے اتنا خیال      کیوں مری غمخواری کا تجھ کو اتنا خیال

دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے  
 اونچے اونچے وار جب اس نے لگائے بارہا دکھ گئی نازک کلائی اور بازو شل ہوا  
 پھر بھلا کس طرح نکلے اپنے دل کا مدعا ہاتھ ہی تیغ آنا کا کام سے جاتا رہا  
 دل پر اک گئے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے  
 کر دیا ہے بے طرح رنج و الم نے خستہ حال موت کا آنا کٹھن ہے اور جینا ہے وبال  
 صبح کرنا شام کا وقت زدہ کو ہے محال کس طرح کاٹے کوئی شہائے تارِ نرنگال  
 ہے نظرِ نوکر وہ اخترِ شماری ہائے ہائے  
 کون ہے اب سینے والا کس کہنے اپنا حال دور کیجئے کس کی صورت کھیکر دل کا ملال  
 کوئی دیکھے تو مری حیراں نصیبی کا کمال گوشِ محروم پیام و چشمِ محروم جمال  
 ایک دل تس پریرنا امیدواری ہائے ہائے  
 نام گوشہ پر دنیا میں ہوا ہے نام و رنگ حال مرزا دیکھ کر اہل جہاں ہوتے ہیں رنگ  
 دل میں باقی تھی ابھی صحرانوردی کی انگ عشق نے کھراڑا تھا غائب ابھی وحشت کا رنگ  
 رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے



کیوں قیدِ زندگی سے دل اتنا ادا ہے جب اس سے چھوٹنا ہے تو پھر کیا ہر اس ہے  
 کہتے ہیں جس کو موت وہ ہر وقت پاس ہے سرگشتگی میں عالم ہستی سے یاس ہے  
 تسکین کوئے نوید کہ مرنے کی آس ہے

پھر تاپے رات دن یہ پریشانِ ادھر ادھر      اس کو نہیں قیام کبھی ایک حال پر  
 وحشتِ زردہ کے حال سے اور غفلتِ اقدار      لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر  
 اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے

جنات کو دکھائی نہ اس درد کی جھلک      محروم اس منزے سے رہے سر بسر ملک  
 ہوں اس عطائے خاص جو منتِ کثر ملک      کیجئے بیان سرورِ تپِ غم کہاں تلک  
 ہر مو مرے بدن پر زبانِ سپاس ہے

ہوتا ہے مہکتوں ہی سے انسان بُرا بھلا      صحبت ملی بھی اس کو مگر کیا اثر کیا  
 ہونا تھا آشنائی دل سے حق آشنا      بے وہ غرورِ حسن سے بیگانہ وفا  
 ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

سودا ہی ہیں وہ جنگو بے مہرباں و اجتناب      انساں کو چاہیئے کہ پئے جائے بے حساب  
 کرتا ہے خوب جذبِ رطوباتِ آفتاب      بی جس قدر ملے شبِ ہتاب میں شراب  
 اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

مزا پہلے دشت میں چاروں طرف اُسد      رولق فراواہاں ہے درختوں کی صفِ اُسد  
 دِشتمیں ہے باعثِ قدرِ صفِ اُسد      ہر اک مکان کو بے مکین سے شرفِ اُسد  
 مجھوں جو مر گیا ہے تو جنگلِ ادا اس ہے

میری غمخواری پر بحث قلیل و قال ہے      طلب کو میرے پائے کوئی کیا مجال ہے  
کہتا ہوں سب مجھ اور زبان میری مال ہے      گر خاموشی سے فائدہ اٹھائے حال ہے  
نوشیوں کو یہ کیا بانی مضمنی مجال ہے

اجہ جہ باہر سن کے دل کا رکھ      زبان ہے برج ستار کا رکھ  
سننا رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ      کہتے رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ  
دارِ روضہ حریف زبان پائے مال ہے

وارنہ کوپ سے نہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ      کہیں مری ہوں کاش کبھی جلوہ آفتاب  
مشاق سے نہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ      رہے میں ہے آہ نہ پڑا اسے غدا  
رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ

پر ہوا اس کی بچہ بچہ      ہر شے ہو گئی سے اسے ہم ہر شے  
رہنے ہو گیا ہو گیا ہو گیا ہو گیا      سب سے جدا نکلا اسے وہ اور دشمن  
سب سے جدا نکلا اسے وہ اور دشمن

خوشی سے نہ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ رکھ      یہ پروردگار دیکھتے ہیں نرس و نرس  
انسان کے ہاتھ ہیں شب و روز ان      کہیں کہاں کہیں علم کے قدم سے نرس

ناف زلیں سب ذلہ و غزال ہیں  
یہ رشہ رشہ

گردش کا میری اور ہی کچھ رنگ تنگ ہے      گردوں بھی دیکھ کر مری حالت کو تنگ ہے  
جوشِ جنوں میں یتنگ و دوکی انگ ہے      وحشت پہ میری عرصہ آفاق تنگ ہے

دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے

مرزا کی طرح نفس کو سمجھائیو اسد      اس خواب پر نہ بھول کر اترائیو اسد

دھوکہ نہ دیا ہر سے کہیں کھائیو اسد      ہستی کے مت فریب تی آجائیو اسد

عالم تمام حلقہ دایم خیال ہے



غیر سے تجھ کو محبت ہی سہی      تجھ سے دنیا کو الفت ہی سہی

تجھ سے دنیا کو سبقت ہی سہی      عشق سے تجھ کو وحشت ہی سہی

میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

کوئی ایسی خطا کی ہم نے      جس سے لائق نہ رہے محفل کے

حاشیہ ۱۳۶ کا۔ مشکیں لاس کبہ کعبہ سیاہ خیریدہ ارجاع۔ اب غزال ایک خاص قسم کا  
ہر ص کی ناف سے مشک نکلتا ہے اسے ناف غزال کہتے ہیں۔

ناف میں۔ زمین کا مرکز حضرت علیؑ کے دامن تھے۔ او۔ ان کے خلیفہ علیؑ۔ عاتق حضرت علیؑ کی  
تولید کرتے ہوئے فرماتے ہیں یہ مات متبور ہے کہ وہ وسط میں ہے یعنی زمین کا مرکز ہے لیکن یہ بات نہیں کہ  
وہ ناف غزال بھی ہے۔ حضرت علیؑ کی ہر بانی سے کعبہ کے شعب کی خوشبو تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔

سلسلہ کچھ تو لگائے رکھئے قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے

کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

ہے کہاں کی یہ بھلا دانائی کیوں ہے مرغوب تمہیں تنہائی

نہ جنونی ہوں نہ میں سودائی میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی

اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

عالم کن کو دبستاں سمجھو اس سے ملتا ہے سبق انساں کو

بھول کر غیر کا احساں نہ لو اچھی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو

آگہی مگر نہیں غفلت ہی سہی

ہے کہاں مثل شرر اسکو قیام گرم رفتار یہ رہتی ہے مدام

نہ توقف ہے نہ دم بھر آرام عمر ہر چند کہ ہے برق خرام

دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

رات دن عشق کا دم بھرتے ہیں رنج و ایذا سے نہیں ڈلتے ہیں

ان پر مرت کے لئے مرتے ہیں ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں

نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

۱۔ ایک حدیث ہے جس کا معنی یہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا یعنی اپنی ہستی ہی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت غائب فرماتے ہیں جو کچھ حاصل ہوا اپنی ہی ہستی سے ہونا چاہیے۔ اگر اپنی ہستی سے معرفت حاصل نہیں ہو سکتی تو اپنی ہستی سے غفلت ہی حاصل کرنا چاہیے۔ خودی مٹی جب مٹی خدائی۔ حاصل کلام ہر کردوسرے کا احسان نہیں اٹھانا چاہیے۔

شاد ہیں دور میں تیرے اہلاف اور ناشاد و حزیں ہیں انحراف  
 اس قدر دین نہ ہوگی اہراف کچھ تو دے اے فلک نا انصاف  
 آہ و فریاد کی فرصت ہی سہی

بحر میں غم کو ترے پالیں گے داد بھی اس کی کبھی پالیں گے  
 جس طرح ہو گا یہ دن ٹالیں گے ہم بھی تسلیم کی خود ڈالیں گے

بے نیازی تری عادت ہی سہی  
 کیا عجب ہے کہ وہ شرمائے اسد کچھ کرے رحم ترس کھائے اسد  
 یہی مزا کی بھی ہے رائے اسد بار سے چھیر چلی جائے اسد  
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

(۸۳)

آوازے رات غیر سحر تک کسائے دل کھول کر مذاق برابر کیا کئے  
 پاکر خموش مجھ کو جو چاہا کہا کئے اس بزم میں مجھے نہیں بنتی جیا کئے  
 بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے

بن کر فقیر میں ترے در پر اگر گیا در بان مجھ کو دیکھ کے غصے میں بھر گیا  
 چپ چاپ میں جو تیری گلی سے گزر گیا دل ہی تو ہے سیاستِ دہاں سے ڈر گیا  
 میں اور جاؤں در سے ترے بے صدا کئے

آئی ہے پھر چن میں بہارِ خمستہ پے  
قسہ ہوا ہے زبردِ ریائی کا آج طے  
اس مہمان کی نجی خاطر عزیز ہے  
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و بجا دہ رہن

مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے

ہو دستیاب آدمی کو گرچہ عمرِ خضر  
وانا کبھی نہ لے اسے دو گرچہ عمرِ خضر  
لاکھوں ہی پائیں ایک نہ دو گرچہ عمرِ خضر  
بٹے صرف ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر

حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے

سپا امین اس کو سمجھتے رہے فہیم  
اب وہ جوابات کہیں ہں نذرِ نسیم  
سب مال اس نے ہضم کئے بے ہراس و بیم  
مق و رہو تو خاک سے پوچھوں کہ لے لیم

توبہ وہ گہجائے گہراں مایہ کیا کئے

۱۰ ات بے ہمایہ ہا کی جستجو  
بہتان اٹھاتے رہتے ہیں ہنگامِ گفتگو  
پھرتے ہیں مائے مائے تحسین میں کو بکو  
کسی ریز تہمتیں نہ تراشائے عدو

کس دن ہمارے سر پہ نہ آئے چلا کئے

آخر بڑی کہاں سے اسے بمنشینِ خو  
ہر گز کسی حسین کو زیبا نہیں یہ خو

ملہ حرد و سجادہ۔ یعنی گودری و سنے دونوں کو رہیں رکھتے پھرتے ہیں۔ دوسرے موسم ہمارے ہیں نظر ہے  
گوناواری ہے پھر دونوں حیزوں سے کام لیتے ہیں۔ خوب شوخی دکھلائی ہے۔

۱۱ حضرت خضر عرِاوداں رکھتے ہی طر کیا گا کہ وہ بھی قیامت کے روز یہی کہیں گے کہ ہم نے کچھ نہ کیا بھلا  
عمر گزار دی۔ عمر کے متعلق ایک اور شعر بھی کہا ہے یہ

وہ زندہ ہم ہیں کہیں روساں خلق لے حضر  
نہ تم کہ چور سے عرِ جاوداں کے لئے



رکھنا تھا پیشتر تو نہ وہ مر جیں یہ خو صحت میں بغیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو  
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے

انکھوں میں یوں تو اور کئی دنیا میں نازیں لیکن نہیں ہے سادہ دل ایسا کوئی جس میں  
پرہیز میں تو اس کو کہوں گا نہ ہم نشیں حسد کی ہے اور بات مگر خوبری نہیں  
بھولے سے اس نے سیکڑوں دے وفا کئے

مہر نے عرض حال کا پایا جواب کیا لوگ تم اپنی بات کا اچھا جواب کیا  
چاہو نہ تم جواب تو اس کا جواب کیا خاک تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا  
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے



وحشت اثر حیات جہانِ شراب ہے مثل شر قیام کی یہاں کس کو تاب ہے  
اس رہ گزرتی ہو ہے وہ پاد در کاہ ہے رفتار عمر قطع رہ اضطراب ہے  
اس سال کے سب کو برق آفتاب ہے

یہ بزم سنیں رنگ نرالی بہار کے ہر جام پُر شراب گل تر ہے دیکھ لے  
مرغِ چمن کا ہے بطے پرگیاں مجھے مینا کے ہے سرو نشاٹ بہار سے  
بالِ نذر و جلوہ موجِ شراب ہے

تھا دل کو شوق اک نگہ التفات کا معلوم تھا نہ حال ان آنکھوں کی گھات کا

طے ایک تیر میں ہوا قصہ حیات کا زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا  
نے بھل گئے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

دہر خراب میں ہے خرابات کی صفت مژدہ ہوئے نشوں کو نو مستوں کو تہنیت  
جاگیر یہ وہ ہے کہ انھیں کو ہے تولیت بادا و بادا نو ٹی زبداں ہے شش جہت  
غافل گداں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

تارِ نظر کو کرتی ہے اس کی چمک فنا اس پر نگاہ ڈالے کسی کو ہے تاب کیا  
آساں نہیں ہے ہر درختاں کو دیکھنا نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا  
جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

پہلے ہی کچھ تو شوق میں تھا حالِ لبوں دیدار سے تو اور بھی اس کا بڑھا جنوں  
اب اور ہی کچھ اس کو تمنابے کیا کہوں میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں  
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

جھڑتے ہیں پھول یوں تو لبِ زدا سے مرزا یہ گل مرے لئے کیا کم ہیں خار سے  
یہ اور بات چیت کرے اس نگاہ سے گمراہ اسد مسرت پیغام یار سے  
قاصد پر غم کو رشک سوال و جواب ہے

وہ اگر میری تمنا پر ترس کھا جائے ہے سامنے آنکھوں کے برق حسن بچکا جائے ہے

خود بخود آنکھوں کے آگے خیرگی چھا جائے ہے      دیکھنا قسمت کراپ اپنے پر رشک جائے ہے

میں سے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

لا نہیں سکتی ہے ہرگز تاب آتش کوئی شے      ہوتے ہی دوا آتش تیزاب ہو جاتی ہے

سوزِ بہناں بڑھکے قہر خود بخود کر دیگا طے      ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گرا نہی شے میں ہے

آہیگنہ تندئی صہبا سے پگھلا جائے ہے

تھا مناسب کوئی تدبیر ایسی دشمن کی کمرے      گفتگو میں تانہ وہ ہر بار بے باکی کرے

کیوں دل اسکا بڑھے جب گزرتی کرے      غیر کو کیونکر وہ یارب منع گستاخی کرے

گر چیا بھی اس کو آتی ہے تو شرم اچائے ہے

صبر کب تک کیجئے اور کب تنگ غم کھائیے      تاب کے حال دل پُر درد سے دکھ پائیے

دل کو ضبطِ نالہ کی تدبیر کیا بتلائیے      شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے

دل کی وہ حالت کرم لینے سے گھبرا جائے ہے

کیا مسرت خیز ہے اے دوست تیری بزمِ گاہ      تو جہاں ہو پھر وہاں غم پانہی سکتا ہر راہ

واہ ہوتی ہے وہاں جا کر اگر کرتا ہوں ہ      دورِ چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

لغہ ہو جاتا ہے واں گزنا لہ میرا جائے ہے

اے حضرت غالب نے یہ ایک نیا مضمون باندھا ہے وہ غیروں کے بجائے اپنے آپ سے ہی رشک کر رہے ہیں۔

فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے محبوب کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنے آپ پر بھی رشک آ جاتا ہے لہذا میں اس رشک کی وجہ سے اس کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتا ہوں۔

ابک اور شرا ہی مضمون کہہ رہے ہیں رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے چہرے میں ملے انکی تمنا نہیں کرتے۔

ہم یکب کہتے ہیں ظاہر ہو کوئی انداز عشق  
یا ہمیں دنیا کہے وارفتہ و جانبا ز عشق  
کیا کریں جب بدحواسی اپنی ہو غماز عشق  
گرچہ ہے طرز تعافلی پردہ دایر از عشق  
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

دشمنوں کے حال پر وہ آج کل ہے ہر یاں  
کچھ ہماری بھی نے اتنی اسے فرصت کہاں  
وہ ہے اور آٹھوں پہر اغیار کی دلداریاں  
اسکی بزم آرا یاں سکر دل زنجوریاں  
مثل نقش مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

اک تو قدر نہ ہی لے اسکو ناز میں پیدا کیا  
اور اس میں تھا ہی کیا ناز و نراکت کے سدا  
اور سیر نے بہ سہاگ عشق کا آنا ہوا  
ہو کے عاشق وہ پری رخ اور مازک بن گیا  
رنگ کھلنا جائے ہے بہتہ کا اڑتا جائے ہے

دیکھیے تصویر کی سبکبیدی بھی افرو ساز یہ  
اور عقیق لب میں ظاہر جو ہر اہجاز ہیں  
اللہ اللہ اکب کہنے میں ہی سوا ملاز ہیں  
نفس کو اس کے مصو پر ہی کیا کیا ناز ہیں  
کہینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کہینچتا جائے ہے

رکھتے ہیں سر سے احباب طن بغض و حسد  
دیکھتے اس بلیسی کی بھی کہیں ہوتی ہر حد  
تیرہ نختی لائی ہے کیا رنگ اللہ لصد  
سایہ میرا مجھ سے مثل دور جھلکے ہر اسد  
پاس مجھ تڑش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

جاں نثاری کی تمنائے آب گل میں ہے      کچھ تمنا اور ہی لیکن دل بسمل میں ہے  
کیا کروں تدبیر بارب جان اک منگل میں ہے      سادگی پر اس کی مہربانی کی حسرت ل میں ہے  
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کف قاتل میں ہے

دل سے دل کورا ہے مجھ کو یقین ہرگز نہ نفا      گفتگو کی آج کچھ اس نے تو عقدہ کھل گیا  
کوئی میرے جی سے پوچھے اسکی باتوں کا مزا      دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا  
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

قطع مجھ سے کر چکے وہ دوستی کا سلسلہ      ان کی بزم عیش کے قابل کہاں ہیں غمزدہ  
پھر بھی ہر دم کچھ نہ کچھ رہتا ہے میرا تذکرہ      گریہ ہے کس کس برائی سے لے بائیں ہمہ  
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

تو اگر چھا جائے گی ہم پر مصیبت ڈھائیگی      جب نہ ہوگا شغل دل پر اک قیامت آئیگی  
زندگانی بے مزہ کر کے مزا کیا پائے گی      بس ہجوم ناامیدی خاک میں مل جائیگی  
یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے

ہم تو کرتے سر کے بل چل کر رہ مقصود طے      بیٹھنے کا ضعف کرتا ہے تقاضا پے بپے  
پاؤں نے پکڑی زمین زنجیر پائے کوئی نشے      رنج رہ کیوں کھینچے واما ندگی کو عشق ہے  
اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

دلِ رقیبِ روسیہ کا پیش کی منزل سہی ہم نے لوماناکہ ہم جلتے ہی کے قابل سہی  
 سوزِ غمِ رگہائے تن میں خون کے قابل سہی جلوہ زارِ آتشِ دوزخ، ہمارا دل سہی  
 فتنہٴ شورِ قیامت کس کے آب و گل میں ہے  
 تھاترے نزدیک مرزا قابلِ قہر و عتاب پھر کیا اک بے گنہ کو کیوں گرفتارِ عذاب  
 اُن مصیبتِ نکالِ اسکو کہ حالتِ ہر خواب ہے دلِ شوریدہٴ غالبِ طلسمِ پیچ و تاب  
 رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے



خالی نہ تیری چشمِ کرم کی نظر گئی چمکی مثالِ برقِ ادھر آئی اُدھر گئی  
 سینے ہی تک نہ صرف یہ اگر گزر گئی دل سے تری نگاہِ جگر تک اُنز گئی  
 دونوں کو اک ادا میں رضا مند کر گئی  
 وہ دورِ جام ہے نہ وہ ہے پرستیاں وہ ہزمِ دلِ ربا ہے نہ ساقیِ دِلستاں  
 سرخوش کہاں رخا ہے ہی اتوں مگر کہاں وہ بادۂ شبنام کی سرمستیاں کہاں  
 اچھے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی  
 مدت سے آرزو تھی دل بے قرار میں پھر ہوں تو اڑ کے جایئے ہزمِ نگاریں  
 مرکزِ پہنچ گیا ہوں میں اس رہ گزاریں اُڑتی پھرے ہے خاکِ مری کوئے یاریں  
 بارے اب اے ہوا۔ ہو بس بال و پر گئی

کیوں کر بھائے ہم کو نہ پرواز نقش پا      گھر کر رہا ہے دل میں ہر اک باز نقش پا  
دلکش ہے کتنی طرزِ فسوں ساز نقش پا      دیکھو تو دل فریبی اندازِ نقش پا  
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کستر گئی

تھی خاص یہ روش کبھی مردانِ کار کی      یہ وضع ہر وضع نے اب اختیار کی  
جاتی رہی تمیز ہی اغیار و یار کی      ہر لواہوس نے حسن پرستی شعار کی  
اب آبروئے شبوہ اہلِ نظر گئی

عالم ہی اور ہے ترے حسنِ شباب کا      مشکل ہے دیکھنا رخ پر آبِ تاب کا  
بے سود و رائیگاں ہوا اٹھنا حجاب کا      نظارہ نے بھی کام کیا وہاں نقاب کا  
مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

بانا وہ مجھ سے ہاتھ چھڑا کر غضب ہوا      ہر چہز تم نے وعدہ فردا کیا تو کیا  
دشوار ہو گیا دلِ مضطر کا تھامنا      فرد و دنی کا تفریق بارمٹ گیا  
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مرزا کی طرح دیکھتے تھے شاداں تمہیں      پیری میں بھی جہان نے پایا جوان تمہیں  
لیکن غمِ عالم نے کیا خستہ جاں تمہیں      مارا زمانے نے اسدا لشداں تمہیں  
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی







میرے سینے پر بے گلِ خن کا گساں ہے زبانِ شمع کی صورت زباں  
کیا بتاؤں اپنے دل کی گرمیاں آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں  
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

ہم نشیں ان سے سفارش کیا کریں حکم یہ ہے نام بھی میرا نہ لیں  
کہئے اب کس طرح راضی انھیں بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں  
پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے

اپنی کو کیا زواں اور کیا خطر صاف کہہ دے گالیاں دی ہوں اگر  
ہو رہا ہے کیوں تاملِ اس قدر دے کے خط منہ دیکھتا ہر نامہ برد

کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

دور میں ہیں چرخِ گرداں پر نجوم رات دن ہیں دائرِ محو و نجوم  
دہریس ہیں وجہِ خیر و شر نجوم قاطعِ اعمار ہیں اکشر نجوم

وہ بلائے آسمانی اور ہے

آچکا ہے غمِ قریب اختتام ٹوٹنے والا ہے کوئی دم میں ام  
منظرِ رہنما ہے مرزا صبح و شام ہو چکیں غالبِ بلا میں سب تمام

ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

اے نوابِ ناز و دلہا و دلہا کو لکھتے ہیں یہ دن مجھ پر گزرتے ہیں گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہے جیسا زبانِ گہائی  
پینے والے جانور کا۔ خصوصاً اس توڑی کرشمہ کا جو ہم سے آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں لے میری ہدیٰ و قور  
کو لکھتے ہیں وہاں کو کیا پوچھتے ہو؟ قدرِ ناز و فضلہ کے مرکز میں یہی ایک تیر باقی تھا قاتلِ ایسا عام۔ بوٹا ہے دانی خدا

کچھ وہاں کی خبر نہیں آتی      کیوں صبا راہ پر نہیں آتی  
کوئی تدبیر کر نہیں آتی      کوئی امید بر نہیں آتی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی

چرخ آزار کے ہے کیوں درپے      چین دیتا نہیں مجھے ہے  
ہوتی ہے اپنے وقت پر ہر شے      موت کا ایک دن معین ہے  
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

دل ہی جب گم ہے دل لگی کیسی      پاس تھا جب تو کچھ انگ بھی تھی  
کچھ ہمیں اب تو ہو گئے مٹی      آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی  
اب کسی بات پر نہیں آتی

حسن بندوں کا ہے ریاضتِ زہد      بسندگی اور نیک سیرتِ زہد  
زیورِ عبودیتِ عبادتِ زہد      جانتا ہوں ثوابِ طاعتِ زہد  
پر طبیعتِ ادھر نہیں آتی

بقیہ صفحہ ۱۹۱ - سخت کال ایسا پڑا وہاں کیوں ہو؟ - لسانِ اغیب نے دس برس پہلے فرمایا ہے

جو چکیں قلابِ بلا میں ستیام      ایک مرگ ناگہانی اور ہے  
میاں شادی کی بات غلط نہ تھی مگر میں نے وہاں عام میں مرزا پہنے لائق نہ سمجھا۔ واقعی اس میں میسری  
کسیر شان تھی بعدِ رنجِ فساد ہوا مجھ لیا جانتے گا۔

ہونے دو حسرتوں کا دلیں خوں وہ بگڑ جائیں گے اگر کہدوں  
اپنے دل میں ہے اور ہی مضموں ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ چپوں  
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

میرے نالے کہیں ٹھہرتے ہیں جا کے روزان کے کان بھرتے ہیں  
خوش تو ہیں وہ مگر مکتے ہیں کیوں نہ جیخوں کی یاد کرتے ہیں  
میری آواز گر نہیں آتی

دکھ سے فست جوں ذرا پاتا چیر کر سینہ تجھ کو دکھلاتا  
سقل ہوتی تو خود سمجھ جاتا داغ دل گر نظر نہیں آتا  
بو بھی اس چارہ گر نہیں آتی

بے شکایت عبت تغافل کی کیا کہیں کچھ خبر نہ اس نے لی  
جب ہمیں خود خبر نہیں اپنی ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی  
کچھ ہمساری خبر نہیں آتی

روز کے غم سے جان پر ہے بنی یا رب اس سے نجات کب ہوگی  
ہو گیا سیر زندگی سے جی مڑتے ہیں آرزو میں مرنے کی  
موت آتی ہے پر نہیں آتی

۱۔ غالب صاحب لطیف نگرا کی کو لکھا ہے "میرا بکا دو کونین" مولانا فضل حق ایسا دوست مرحلئے عتاب  
نیمہ رونا نیم جاں رہا طعنے عمتہ ہیں آرزو میں مرنے کی آگے آتی تھی حال دل یہ سنسی الم اگر جوان ہوتا اور میرا رہ  
آپ سے دعا ہے خیریت جاہتا اسی برس کا لڑکا ہوئے آیا ہوں دعا کے نصرت کا اسید وار ہوں (ماقی ص ۱۲۳)

ہوش میں تم جو آؤ گے غالب      ہند مڑا سے پاؤ گے غالب  
 حق کو کیا منہ دکھاؤ گے غالب      کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب  
 شرم تم کو مگر نہیں آتی

(۹۱)

نالہ و آہ میں دھرا کیا ہے      حاصل گریہ و بُکا کیا ہے  
 اس ترپنے سے مدعا کیا ہے      دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے  
 آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہے یہاں دل کو شوقِ جلوہ یار      اور وہاں پر وہ مانعِ دیدار  
 ان کو ہے بات بات پر انکار      ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار  
 یا الہی یہ ماجرا کیا ہے

غیر کب تک کہے گا حالِ دروں      آپ کب تک سنیں گے یہ مضموں  
 ہو چکی انتہائے ضبط و سکون      میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں  
 کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

باقی ص ۱۶۴ :- شرابِ کجخت ابھی چھوٹی نہیں۔ غارِ کاب بھی عادی ہوتا نہیں۔ "عانت ہوں نوا طاعتِ زہدِ لا  
 کبھے کس منہ سے جاؤ گے غالب ۱۶۱

۱۶۵ میر بھری کو ایک خط میں لکھتے ہیں "میر بھری و میر فرراز حسین مجھ سے ناخوش اور گورکھ مند ہوں گے اور کہنے  
 ہوں گے کہ دیکھو میں خط نہیں لکھا ہے میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں۔ کاش پوچھو کہ ماجرا کیا ہے  
 ماجرا یہ ہے کہ میرا بھی تو کوئی خط نہیں آیا جس کا جواب لکھتا ہے"

کہتے ہیں واقفانِ غیب و خہود      ایک ہیں عبد و عابد و معبود  
آخر ان کا ہے اس سے کیا مقصود      جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود

پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

جنگٹے کیسے عاشقوں کے ہیں      اور معشوق کس کو کہتے ہیں  
حسن کے پھر یہ کیسے جلوے ہیں      یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں  
عشوقہ و غمزہ واد کیا ہے

ایک سے ایک نازیں کیوں ہے      دام بردوش ہر حسیں کیوں ہے  
فکر صیدِ دلِ حزیں کیوں ہے      شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے  
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

کس لئے پھول رنگ لائے ہیں      کیوں یہ لالے نے داغ کھائے ہیں  
کس نے یہ تازہ گل کھلائے ہیں      بزمِ و گل کہاں سے آئے ہیں  
اب کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہیں محبت کے بھی نرالے بھید      آہ نغمہ ہے اس میں نازِ نشید  
یاس کو مزہ اور اجل کو نوید      ہم کو ان سے وفا کی ہے امید  
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

دُکھ کسی کو دیا تو کیا ہوگا      تیرے حق میں بہت بُرا ہوگا  
بد نتیجہ بُرائی کا ہوگا      ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا  
اور درویش کی صدا کیا ہے

کب یہ مکر اختیار کرتا ہوں      کب دعا بار بار کرتا ہوں  
 طرز دشمن سے عار کرتا ہوں      جان تم پر نثار کرتا ہوں  
 میں نہیں جانتا دعا کیا ہے  
 مثل مرزا ہے گود میں غالب      شعر کہتا ہے دل نشیں غالب  
 ہے مگر رند بالیقین غالب      میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب  
 مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

اے چارہ گرو تم انہیں سمجھ کے تو ہو آئے      اور ساتھ لے مرزدہ آمد بھی ہو گو آئے  
 اظہارِ تمنا سے مگر بات ہی کھو آئے      کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالب ہو لے  
 اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وو آئے  
 اسانِ اجل ہے جو ذرا دے مجھے ہلت      ہے اس کے نظارے کی تمنا دمِ رعلت  
 وہ دیکھ تو لے آنکھ سے اپنی مری حالت      ہوں کش مکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت  
 کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے دیکھنے کو آئے  
 اگر مرے گھر بھی وہی وحشت ہے وہی رم      آتے ہی اجازت کے تقاضے ہوئے پیہم  
 مشکل ہے قیام ایک جگر کا انہیں ک دم      ہے ماعتہ و شعلہ و سیلاب کا عالم  
 آنا ہی سمجھ میں میری آتا نہیں گو آئے

تربت میں مری آکے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 پریش سے بھی اکٹاکے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 مردہ بھی مجھے پاکے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 ظاہر ہے کہ گھر کے نہ بھاگیں گے نیکرین  
 ہاں منہ سے مگر بادہ دوشینہ کی بو آئے

ہیں تیغ بکف کون جو پھرتے ہیں اکثرے  
 یہ کون ہیں جو وعظ میں دنیا سی ہیں لڑتے  
 درپردہ کوئی اور ہے ہم کس سے بگڑتے  
 جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھکڑتے  
 ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہم ہوں تو ہر انسان ہیں طعنے نیا یافت  
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نیا یافت  
 ہم گم ہوئے اور ختم ہوئے طعنے نیا یافت  
 ہاں اہل طلب کون سنے طعنے نیا یافت  
 دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

ہم وہ نہیں ناکامیوں کے نام سے بیٹھیں  
 اندیشہ مایوسی انجام سے بیٹھیں  
 رنج سفر و سختی احرام سے بیٹھیں  
 اپنا نہیں وہ شیوہ کرام سے بیٹھیں  
 اس در پر نہیں یار تو کہے ہی کو ہو آئے

اس شوخ کے لانے کی تو کرنے کے تدبیر  
 اور واں ترے رنے کی لگے کھینچنے تصور  
 ڈوبی ہوئی تقدیر سے الٹی ہوئی تاثیر  
 کی ہم نفسوں نے اثر گر یہ میں تقریر  
 اچھے رہے آپ اس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

لے بادہ دوشینہ سے مردرات کی پی ہوئی شراب ہے اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں دوشینہ نیکرین  
 سوال و جواب کیلئے آئے ہیں۔ غالب صاحب غنی کے انوار میں فرماتے ہیں نیکرین کے سوال و جواب بچے کی ہی صورت  
 ہے کہ مرنے سے پہلے مجھے شراب پلا دو فرشتے قبر میں شراب کی بوتل بھاگ جائیں گے اور میں سوال و جواب کی رحمت سے  
 بچ جاؤں گا۔ (کیا خوب انوار بیان ہے)



اک لطف وہاں عید کا دن رات ہو غالب      کیا جلسہ یارانِ خوش اوقات ہو غالب  
 مہرِ آس کے لئے وہ درِ حاجات ہو غالب      اس انجنِ ناز کی کیا بات ہے غالب  
 ہم بھی گئے وال اور تری تقدیر کی رو آئے

(۹۳)

جب سے رنگِ بہار طاری ہے      کچھ عجب کیفیت ہماری ہے  
 پھر لہو چشمِ تر سے جاری ہے      پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے

سینہ جو یائے زخمِ کاری ہے

پہلے بے کارِ محض تھا ناخن      اب مگر کام دے گیا ناخن  
 داغِ دل کی طرف بڑھا ناخن      پھر جگر کھودنے لگا ناخن

آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر عبادت کا ہے نبیٰ انداز      اور ہی سمتِ رخ ہے وقتِ نماز  
 سن کے ناتقے کی دل ربا آواز      قبلہ مقصدِ نگاہِ نیاز

پھر وہی پردہِ عماری ہے

ہو کے گاہک بنے ہیں سودائی      دیدہ و دل کو کچھ نہ سدھائی  
 رہ گئی ان کی ساری دانائی      چشمِ دلالِ جنسِ رسوائی

دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

مل کے دونوں نڈے یہ ٹھہرائی      ایک عالم بنے تماشا  
دونوں ذلت کے ہیں تمنائی      وہ ہی صدرنگ نالہ فرسائی  
وہ ہی صد گونہ اشکباری ہے

تنگ ہوں بھر جاں گزار سے پھر      عشق ہے اس قدر دراز سے پھر  
مست ہوں چشم نیماز سے پھر      دل ہوا ہے خرام ناز سے پھر  
محترستان بے قراری ہے

حسن پھر ترک تاز کرتا ہے      پھر دیرِ فتنہ باز کرتا ہے  
خونِ اہل نیاز کرتا ہے      جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے  
روز بازارِ جاں سپاری ہے

لاکھ صدے نئے گزرتے ہیں      جان اس پر نثار کرتے ہیں  
پھر دم اس پر دغا کا بھرتے ہیں      پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں  
پھر وہی زندگی ہماری ہے

ق

اُٹے ہیں داد خواہ اہل نیاز      ہیں جفا پیشہ گوشِ براواز  
ظاہر اب ہوں گے حسنِ عشق کے راز      پھر کھلا ہے دیرِ عدالت ناز  
گرم بازارِ فوجداری ہے

ہرز بردست ہو گیا ہے شیر      زیر دستوں کو کر رہا ہے زیر

عدل وانصاف میں نہ کیوں ہو دیر ہو رہا ہے جہاں میں اندھیر  
 زلف کی پھر سرشتہ داری ہے  
 پھر کیا دل نے یوں بیاں احوال رو دیئے سُن کے حاکم و عمال  
 سرِ اجلاس پھر بے قال و مقال پھر دیا پارہ جگر نے سوال  
 ایک فریاد و آہ وزاری ہے  
 ابھی ثابت نہیں جفا کا سبب نہ ابھی ہے ثبوتِ قہر و غضب  
 دیکھئے ہو معاملہ طے کب پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب  
 اشکباری کا حکم جاری ہے  
 عشق انصاف پر اگر آیا بال کی کھال ہی نکالے گا  
 دیکھئے اس کا ہو نتیجہ کیا دل و خرگاہ کا جو مقدمہ تھا  
 آج پھر اس کی رو بکاری ہے  
 ہے یہ مرزا کو تو یقیں غالب ہوئے مغلوب تم کہیں غالب  
 مل گیا ہے کوئی حسین غالب بے خودی بے سبب نہیں غالب  
 کچھ تو ہے جسکی پردہ داری ہے

کی کرشی تو فرطِ زحمت سے خم ہوئے اپنی تعلیوں سے نخلِ دم بدم ہوئے

گھر گھر نشاط و عیش کا جوش و خروش ہے      بزم طرب کہیں ہے کہیں ناؤ نوش ہے  
اور یہاں دفرِ غم سے پرگندہ ہوش ہے      ظلمتِ کبرہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے  
اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے

ہے چونکہ دریا بحر میں دونوں کا ایک حال      ممکن نہیں کہ ایک سے ہو ایک کو ملال  
باہم نہیں ہے رشکِ حسد کا کوئی خیال      نے خردہ وصال نہ نظارہ جمال  
مدت ہوئی کہ اشتیاقِ چشم و گوش ہے

کم کر دیا ہے نشہ ساقی کا اجتناب      سر کا ہے آج رخ سے ذرا گوشہ نقاب  
دیدار سے ہے دیدہ مشتاق کامیاب      نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب  
اے شوق ہاں اجازتِ تسلیم ہوش ہے

اس کے گلے کا حار جو در نہیں ہوا      گویا صدف کا اختر قسمت چمک گیا  
اک رشک اور بھی ہے صدف کا تو ذکر کیا      گوہر کو عقد گردنِ خوباں میں دیکھنا  
کیا اوج پر ستارہ گوہر فروش ہے

اے غالب صاحبِ شاعر کو اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے: "اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے" یہ خبر ہے پہلا مصرعہ "ظلمتِ کبرہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے" یہ خبر ہے "شبِ غم کا جوش" یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ظلمتِ غلیظہ گھرنے لگا گیا غلطی ہی نہیں ہوئی۔ ہاں "لیکھ لیلِ صبح" پر ہے یعنی بھی ہوئی صبح۔ اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو کچھ حایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیلِ صبح لکھا گیا ہے وہ خود ایک سببِ بختِ اسبابِ تاریکی کے۔ پس دیکھا چاہیے جس گھر میں علامتِ صبح مؤید ظلمت ہوگی وہ گھر کتنا تاریک ہوگا۔

ہے شکر کی جگہ کہ نہیں ہم وہ ہے پرست      دو گھونٹ میں جنہیں نہ ہے ہوش پاؤ دست  
اچھا کیا تمہارے تصور نے نذر و بست      دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست  
بزم خیال میکدہ بے فروش ہے

ق

کرتی غلی مجھ کو قلتِ ے یا تو مضمحل      یا اب خیال بادہ کشتی بھی ہے حالِ گسل  
کردار سے ہوں اپنی پشیمان و منفعل      اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل  
زہار اگر تمہیں ہوس ناؤ و نوش ہے  
بکھو کچھ آپ اپنے اگر خیر خواہ ہو      سنبھلو ذرا جو طالبِ امن و پناہ ہو  
تم بھی کہیں نہ میری طرح سے تباہ ہو      دیکھو مجھے جو دبیدۂ عبرتِ نگاہ ہو  
میری سنبھو جو گوشِ حقیقتِ نبوش ہے  
اس بزم میں نہ پاؤ گے کچھ غیرِ گمراہی      جاتی رہے گی عقلِ سرا سر رہی سہی  
مجھ پر گزر چکی ہے جو میں نے تمہیں کہی      ساقی بجلوۂ دشمنِ ایمان و آگہی  
مطب پر نغمہ رہن تمکین و ہوش ہے  
کہتے ہیں جس کو اہلِ جہاں محفلِ نشاط      اک خوابِ خوش سے بڑھکے نہیں بساط  
رونق کو اس کی لحظہ بہ لحظہ انحطاط      یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط  
دامانِ باغبان و کعبہ گل فروش ہے  
چاروں طرف نشاطِ جمائے ہوئے رنگ      بجٹا ہے شورِ قلقلِ مینا سے جل ترنگ

ہے دل میں اہل بزم کے اک ہوشیار منگ لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ

یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

ہے انبساط و عیش کا منظر تو بزم میں پیدا ہے لطفِ گردش ساغر تو بزم میں

کچھ زلیست کا مزہ ہے میسر تو بزم میں یا صبح دم جو دیکھے آکر تو بزم میں

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

حالت ہی اور کچھ نظر آتی ہے بزم کی رونق ہی اس جگہ کبھی گویا ہوئی نہ تھی

محفل جو تھی بھری ہوئی سنسان ہو گئی دایۂ فراق صحبتِ شب کی جلی ہوئی

اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے

مرزا نے کی نہ کوئی کمی مرضِ حال میں تا ہو نہ مستما کوئی نے کے وبال میں

اک درد ہے ہر اہوا اسکے مقال میں آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

خائب صربِ خامہ نوائے سروش ہے

گر نہیں ان کو یقین چاہ کا میری نہ ہی جاں لیکر بھی اگر قدر نہ کچھ کی نہ ہی

وہ تیرے کہتے ہیں جان نہیں میری نہ ہی نہ ہوئی گروے مرنے سے تسلی نہ ہی

امحال اور بھی باقی ہے تو یہ بھی نہ ہی

میرے حلقے میں نہیں گل نہ ہی خار تو ہے دل میں اک صورتِ یادِ گل و گلزار تو ہے

گو مسرت سے ہوں محروم غم یار تو ہے      خارِ عالمِ حسرت دیدار تو ہے

شوقِ گلِ چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی

یہ کوئی فرض ہے ہر روز اسے اے ہی بنے      اپنے ہاتھوں سے ہیں جامِ پلائے ہی بنے

یہ نہیں ہے نہ ہوئے آج اڑائے ہی بنے      بے پرستارِ خمِ مہ سے لگائے ہی بنے

ایک دن گرنے ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

بے دیوانے کی گواہی نہ کی قدر تو کیا      جوشِ وحشت نے دیا اس کا ستارہ چکا

ہنی آنکھوں کا بیباک نے بنایا تارا      نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا

گر نہیں شمعِ سیدہ خانہ بلی نہ سہی

رکتے ہیں مجھے احبابِ فضاں کو تاقی      ہر گھڑی جب مجھے گھوٹیں تو نہ کیونکر ہو قلق

زِ عشرت ہی نہیں باعثِ وفقِ مطلق      ایک ہنگامہ پر موقوف ہے گھر کی رونق

نودِ غم ہی سہی نغمہ شادی نہ سہی

یہ سقّل پہ حاسد کے پڑا ہے پردا      کہہ دیا ہے مرضِ رشکِ حسد نے اندھا

لبا پنا اسے سمجھاؤں بھی تو حاصل کیا      نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

سے مرزا جو کہیں اس کو نصیحت سمجھو      ہیں جو ہمدرد تو یہ ان کی عنایت سمجھو

ما جو آئی ہے بہتر یہی حالت سمجھو      فرصتِ صحبتِ خواباں ہی غنیمت سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمرِ طبعی نہ سہی

کبھی کیا تھا نہ ظالم نے اس طرح کرم آگے  
 نہ کی تھی تیغ سرِ قتل گاہ یوں علم آگے  
 ہمارے سائے سے پہلے تو کرتا تھا وہ آگے  
 عجب نشاط سے جلاد کے چلے ہیں ہم آگے  
 کہ اپنے سایہ سے سراپاؤں سے دو قدم آگے  
 مر رہی تھی میراے زمانے کے غم و کلفت  
 خرابیوں سے زمانے کی ہے کہاں مجھے فرصت  
 مے ہی واسطے بیدار ہوئے ہیں ماتم و حسرت  
 قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادہ الفت  
 فقط خراب نکھا بس نہ چل سکا قلم آگے  
 ہمارے دل کی شادی غمِ فراق نے ہستی  
 کچھ اب تو بہت طاقت میں فہر کی ہوئی بستی  
 بے بسائی ہوئی حسرتوں کی اجڑی ہے بستی  
 غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عیش کی مستی  
 مگر نہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے  
 بتائیں کیا کہ تمنا ہمارے دل کی جواب کیا  
 دیا ہے نامہ مگر دل کا ہے کچھ اور ہی سودا  
 گئی ہے دھن کہ نہیں خود جواب کچھ نہ کچھ اسکا  
 خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا  
 کہ اس کے در پر پہنچتے ہیں نامہ برس ہم آگے  
 تمہارے چھوٹے سے سرخ میل گئے ہیں بلا کے  
 تمہارے پھندے میں کیے نہ جیتے جی کبھی چھوٹے  
 یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے  
 ہمارے دل ہی کچھ اٹھا ہوا تھا کیا کہیں ہم سے  
 تمہارے آنیو اسے طرہ ہائے خم بہ خم آگے



بہت دنوں تو ہم اسی مرگے بہت ہے دپے ہم شک فتن بہائیں کہ قصہ ہی کہیں ہوٹ  
اب اپنی ہستی کا عقدہ کھلا کر یہ ہے کیا شے دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موہ نوں ہے

ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے  
وہ اشکِ ماتم مزار میں کب بہاتے ہیں غالب غصہ بے مرنے کی میسے خوشی مٹاتے ہیں غالب  
ملنے خاک میں مجھ کو کہاں وہ آتشی غالب قسم جنازہ پر آنے کی میسے کھاتے ہیں غالب  
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

(۹۸)

آہ کرنے سے غصہ اس کا سوا ہوتا ہے نالہ کرتا ہوں تو سرگرم جفا ہوتا ہے  
لب ہلانا سببِ ترک و فنا ہوتا ہے شکوے کے نام سے بے فہر خفا ہوتا ہے  
یہ بھی مت کہہ کہ جو کہنے تو رگلا ہوتا ہے

تنگ ہوں کب تک ٹھایا کروں میں جو جفا کونسا ظلم ہے جو آپ نے مجھ پر نہ کیا  
بے سبب تو نہیں شکوں کا مرنے تا رہا ہوں میں شکوے سے یوں راگ کر جیسے بلجا  
اک ذرا چھوڑے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

دل غم دوست کی ہے عین تمنا یہ تو ہم جوشاکی ہوں تو وہ اور ستائے ہم کو  
کاش آگاہ وہ اسرارِ شکایت سے نہ ہو گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو  
شکوہ جو رستے سرگرم جفا ہوتا ہے

کمر دیا روز کی گردش نے اسے خستہ حال      پاؤں بھی ابتواٹھا نا ہے اسے سخت محال  
 ہو گیا خلق کو اندازہ رفتار محال      عشق کی راہ میں ہر چرخ ملکوب کی کچھال  
 سست روی سے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم یہاں تک تو ہوئے تو گر بیدار و رستم      دیر ہوتی ہے جفاؤں میں تو ہوتا ہے الم  
 دل کو بے تازہ جراحات کی خواہش ہم      کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیلد کہ ہم  
 آپ اٹھلاتے ہیں گریزِ خطا ہوتا ہے

غمتِ برگشتہ نے لینے ہی نہ دی ہم کو پناہ      رکھتے اے کاش نہ ہم اپنی بھلائی پہ نگاہ  
 کام سب سوئے تدریس ہوئے اپنے تباہ      خوب تھا پہلے ہی سے ہوتے ہم اپنے بدخواہ  
 کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

ڈرے شکوہ نہیں کرتے ہیں کہ ہے تکرارِ دب      ناتوانی کی ہے آخر کوئی حد بھی یارب  
 زارِ نالی بھی ہے رُشوارِ دم رنج و تعب      نالہ جاتا تھا پرے عشقِ بریں سے اور اب  
 لب تک آنا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

طبعِ قدرت نے مجھے دی ہر عجبِ دو فن      میں جو چاہوں ہر قرطاس کھلا دوں گلشن  
 راگِ لاسناب کیا مجھ سے کوئی مرغِ چمن      خام میرا کہ وہ ہے بارِ بد بزمِ سخن  
 شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

ذاتِ کوتیری کیا حق نے پناہ عالم      تیرا سایہ ہر مخلوق پہ ہے ابرِ کرم  
 اہل دنیا کو ترسِ فیض سے ہے عیشِ ہم      اور شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم

تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے  
 محض افسانہ ہیں شاہانِ سلف کے قصے  
 پہنچ ہیں شوکت و اقبال میں تیرے آگے  
 کچھ ٹھکانا ہے بھلا جاہ و شتم کا تیرے  
 سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے  
 تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے  
 گر دیکھتے تیرے لئے فلک کا ہے یہ حال  
 ذرہ ذرہ ترے دروائے کا خورشید مثال  
 ماہِ کامل کو جبیں سائی میں حاصل ہو کمال  
 ہر جہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال  
 آستان پر ترے مناصب سا ہوتا ہے  
 بند ہیں مرغِ چین مجھ سے خوش الحانی میں  
 کچھ نہ کچھ نغمہ سراہوں جو پریشانی میں  
 ہے ترا لطفِ ممد طبع کی جولانی میں  
 میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزلِ خوانی میں  
 یہ بھی تیرا ہی کرم ذوقِ فرا ہوتا ہے  
 کہنے کیا چرخِ ستم کار کو ہی نا انصاف  
 ذکر کیا غیر کا اپنے بھی مہر کے خلاف  
 کوئی ہمدرد نہیں قاف سے لیکر تاقاف  
 رکھو غالب مجھے اس تلخِ نوائی میں معاف  
 آج کچھ دردِ مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بلائے دہرے بے ہاکیوں کی خو کیا ہے  
 تمھارے سامنے انسان کی آبرو کیا ہے  
 کلامِ ہتک یہ دشمن کے رو برو کیا ہے  
 ہر ایک بات پر کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے  
 تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے  
 اُسے حاشیہ منظر ہے

نگاہ گرم سے ظالم نے بس کو دیکھ لیا      جلا کر اس کو کیا خاک دم میں سہرتا پا  
کمال یہ ہے کہ کرتا ہے آگ سے ٹھنڈا      نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برقی میں یہ ادا  
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندر تو کیا ہے

برآسیوں کے ہماری سبق ہزار وہ      یقین ہے کہ نہ فقر وں میں آؤ گے اس کے  
خیال اس کا نہیں ہے کہ وہ جو چاہے      یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے  
وگرنہ خوف بداموزی عدو کیا ہے

نہ دے گا کام رفوگر یہاں تو کچھ فن      اٹھائے طاق میں رکھ اپنے رشتہ و سوزن  
سرکش جسم کے تاروں سے سن چکا دامن      چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیرا ہن  
ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

رہا نہ تن ہی تو دل کا کہاں پتا ہوگا      یقین ہے جسم سے پہلے ہی مٹ چکا ہوگا  
سوائے خاک یہاں دستیاب کیا ہوگا      جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا  
کر دیتے ہو جواب را کہ جستجو کیا ہے

حاشیہ ص ۱۸۰: غزل تہرے غالب صاحب آگے انھوں نے غزل بھی لکھ کر تہر کو لکھا "اگر تم فقیر ہے میں اور اس غزل کا طالب کا ذوق بگا ہے تو یہ غزل اس خط سے پہلے ہی ہوگی۔ نیز یہ غزل شیونرائن آرام کو بھیج کر فرمایا۔  
"یہ تمہارا قبائل ہے کہ کو شہر ماؤ آگے ایک غزل یہ اور دو غزلیں تھو، ماچا جاتی ہیں تیس ہفتہ کا گودام تمہارے پاس درام ہو گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعی سوزنوں لیے ہفتہ وں اخباریں غالب صاحب کا کلام شائع کرتے تھے۔  
کہا جاتا ہے کہ کیرن ذوق پاداشی میں جا ہے تھے کہ غالب کی نظروں پر پڑ گئی چونکہ دونوں میں بمعصرت چٹک چکی  
البتہ غالب نے فی البدیہہ یہ مصرعہ پڑھا ذوق سے سن لیا اور بادشاہ ظفر سے تکلیف کی۔ غالب جب دربار میں گئے بادشاہ  
نے پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ غالب نے یہ پوری غزل سنائی اور مطلع کا یہ مصرعہ بدل دیا۔ ہولہ الخ

غلط کر رہتا ہے جویاے خفرتِ اقل کہیں گے ہم تو کہے اس کی ڈر لا حاصل  
 ہے ہیں شک میں گھل گھل کے کیا جگر کیا دل رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل  
 جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

جہے تو فرقہ زہاد کو ہے اس کی قمیض کہ کس کو کہتے ہیں علماں حوئے کیا چیز  
 ہمیں غرض نہیں کوئی غلام ہو کہ کینز وہ چیز جس کے لئے ہم کو ہو بہشتِ عزیز  
 سوائے بادۂ گلزارِ ام و مشکبو کیا ہے

چڑھا کے سانگو مینا کے نہ ہوں ہر شمار سبو بھی منہ سے لگا کر نہ سیر ہوں زہار  
 یقین کیجئے میں نام کا نہیں ے خوار پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار  
 یہ شیشہ و قدر و کوزہ و سبو کیا ہے

ہمارے حال پران کو کہیں نظر ہو بھی اور انتقاماتِ مریضِ فراق پر ہو بھی  
 نتیجہ خاک نہ ہو گا اگر خبر ہو بھی رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی  
 تو کس امید پر کیجئے کہ آرزو کیا ہے

عروجِ طالعِ غالب اگر اسے بھاتا حسد کی آگ میں حاسد نہ یوں بھنکا جاتا  
 نہ پھر یہ شعروہ مرزا زبان پر لاتا ہوا ہے شہ کا مصاحب پھر کہے اتراتا  
 وگر نہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے



تابِ الم اب مجھے زہار نہیں ہے      قابو میں مرے دل افکار نہیں ہے  
 آہِ ذرا دل پر اختیار نہیں ہے      آکر مری جان کو قرار نہیں ہے  
 طاقتِ بیدارِ انتظار نہیں ہے

دل کو تو قابو میں اپنے لے لیا چلا      کرتے ہیں فرائشِ جانِ جانِ ہم سے  
 لطفِ طے گا بھلا کب عیش سے اسکے      دیتے ہیں جنتِ حیاتِ دہر کے میلے  
 نشہ بہ اندازہٴ نغمہ ساز نہیں ہے

چھائی ہے کچھ اس طرح کی بیکسی اب تو      رونا ہوں ہمارا ہے کوئی نہ ہے دل جو  
 شکوہِ رقیبوں کا کیا کیا تیرا گل ہو      گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو  
 ہائے کہ روتے پہ اختیار نہیں ہے

وہ بھی تو چاہیے کچھ رنج کی آہ      کونسی شے میں ہے پایا عاجز و قاصر  
 چاہو جو تم جان بھی کر سکتے ہیں حاضر      ہم سے عبت ہے گمانِ رنجشِ خاطر  
 خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے

غفلتِ دل سے بھلا کیا پائے معافی      اسیں ہی مٹتی ہے سب دیکھے معافی  
 اس کو سمجھ منزل و ماوا سے معافی      دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معافی  
 غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے

اس پہ کئے میں نے برسوں تک تقاضے      سن کے ہمیشہ مگر کچھ ٹالا ہی اس نے  
 طالع خفتہ مرے اب کچھ تو ہیں جاگے      قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے  
 وائے اگر عہد استوار نہیں ہے  
 تو نے یہ کیا زہد کی ٹھہرائی ہے غالب      چال یہ مرزا نے تری پائی ہے غالب  
 جام و سبو کا تو تو سودائی ہے غالب      تو نے قسم نے کشی کی کھائی ہے غالب  
 تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

(۱۰۱)

زمانے بھر کے رنج و غم ہیں اور تنہا ملول ہے      تھل مجھ سے اس کو وہ گراں کا سخت مشکل ہے  
 بڑھاپے بوجھ اتنا سوئے زانو سر بھی مائل ہے      بھوم غم سے یاں تک ہر رنگونی مجھ کو حاصل ہے  
 کہ تابو دامن و تانہ نظر میں فرق مشکل ہے  
 بھٹے لے چارہ گرد نظر راحت نہیں جن کی      مرے لوں تو اگر کاٹے رگیں بھی میری گزین کی  
 سیئے جائز خم دل پرانہ کر کچھ طعن دشمن کی      رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سنون کی  
 بھیجی موت کہ پاس روستے دیوانہ غافل ہے  
 گلستاں میں گروہ و لوق افرونی کے غالب      تو نور اس کا عطا نرس کو بینائی کے غالب  
 عجیب بولے خوش مرزا کو سودائی کے غالب      وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمایا کے غالب  
 چنگنا غنچہ گل کا صدائے خندہ دل ہے

جس روز کہ تو سیر کو گلزار میں آوے      گل تازہ کھلے نکلتے گل خار میں آوے  
بالیدگی سوکھے ہوئے اشجار میں آوے      جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے

ہاں کالبدر صورتِ دیوار میں آوے  
گل گشت میں پیدا ہو عجب لطف کا منظر      لے بڑھکے بلائیں تری ہر شاخ گل تر  
گل تیرے قدم لینے کو ہوش زہیں پر      سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر  
تو اس قید دل کش سے جو گلزار میں آوے

مانا کہ غم و ہم سے دل زار گھلا ہے      بر سادیے شرکاں نے خود ریا بھی تو کیا ہے  
آنکھیں بھی لہو روئیں تو کیا فر ہوئے      تب نازِ گرا نمانگی اشکِ بجا ہے  
جب لختِ جگر دیدہ خونبار میں آوے

ہر چند ہوا جوش فرو مجھ کو ستا کر      کچھ دل کو ہوئی راحت و تسکین بھی دم بھر  
وہ بات بھی کر جس سے لے لطف مکر      لے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ تم گر  
کچھ مجھ کو مزا بھی مرے آزار میں آوے

اعجاز کا رنگ اپنے بخود کھلائے اشارہ      بے جان کو جاندار بنا جائے اشارہ  
جادو سے غضب بیکے کیا ڈھائے اشارہ      اس چشمِ فسون گر کا اگر پائے اشارہ  
طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے



مصرف دعاؤں میں ہیں کس سے یارب      تا برہنہ پا گزرے کوئی پاس سے یارب  
تکتے ہیں پڑے راہ عجب یاس سے یارب      کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اک آبلہ پا وادی پر خار میں آوے

آیا مرے آغوش میں کب وہ تن نازک      کس دن ہو راحت کا سبب وہ تن نازک  
پھندے میں ہو یوں غیر کے اب تن نازک      مراؤں نہ کیوں رشک سے جب تن نازک

آغوشِ غم حلقہ زنا ر میں آوے

پھیلائے ہوئے دست طلب ہیں سراسر      دیکھا ہے زمانے میں نفیس خوار ہی اکثر  
انساں کیلئے حرص ہی دشمن ہے قوی تر      غارت گرد ناموس نہ ہو گھر ہو سر زار

کیوں شاہد گل باغ سے بازار میں آوے

مانا کہ جنوں کپے تجھے جوش فراواں      باقی ترے ہاتھوں سے رہی جنبہ اماں  
یوں ٹکڑے اڑانا تو نہیں تجھے شایاں      تب چاک گرد بیاں کا فرہے ل ناداں

جب اک نفس البعا ہوا ہزار میں آوے

کیا حال تپ سوز دروں کیئے زباں سے      لگ جائے کہیں آگ نہ گرمی کے بیاں سے  
بہتر نہ کہ نہاں ہی رہے اہل جہاں سے      آتش کدہ ہے سینہ مرا راز نہاں سے

اے وائے اگر معرض اظہار میں آوے

مرزا کی طرح سحر کی قسم اس کو سمجھئے      مغمموں ہے اگر روح تو جسم اس کو سمجھئے  
افسوں اسے ٹھہرائے ام اس کو سمجھئے      گنبدِ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

ماند ہے نجم سحر یار کا خال اچھا ہے اس کے ابرو سے نہ خنجر نہ ہلال اچھا ہے  
 مہر کچھ ہے تو ذرا قبل زوال اچھا ہے حسن مگر چہ بہنگام کمال اچھا ہے  
 اس سے میرا مر نور رشید جمال اچھا ہے

مفت کے مال کے اس رجب ہیں خواہاں کیا وہ اسی دالو اسی گھات ہیں ہیں شام و بگاہ  
 چاہتے ہیں کہ رقم کوئی ملے خاطر خواہ بوسہ دیتے نہیں وردل پہ ہے ہرقت نگاہ  
 جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

کب نیمر ہوا جشید کو یہیمانہ نیا دور میں تادم آخرو ہی اک جام رہا  
 دل سے اترا جو یہاں دور کیا پھینک دیا اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا  
 ساغرِ دم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

کر دیا ہے غم، بجزاں نے مرا سید شوق نام ہی نام برب جان کا باقی ہے رفق  
 رنگ رہتا ہے مرا یوں تو غم و درد سے فراق انکے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر و فراق  
 وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

انکے ہاتھوں سے سی کو بھی نہیں پہنچا فیض دین و ایمان کے یہ دشمن ہیں تو کچھ کس فیض  
 بندگی کیسے بھی دیکھا تو نہ پایا با فیض دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتو س کیا فیض  
 اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فن ہے وہ چیز کہ فرہاد کی دی بات بنا      ورنہ شیریں سے کہے بات یہ اسکا مذاق  
جس ہنریں غمی اسے مشق وہ کام آہی گیا      ہم سخن پیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا  
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

وصل محبوب اے کاش ہمارا ہو جائے      دور جلدی کہیں یہ پڑہ دووی کا ہو جائے  
جزو ہو وصل کل ایک ہی نقشہ ہو جائے      قطرہ دریا میں جوں جائے تو دیا ہو جائے  
کام اچھا ہے وہ جس کا کمال اچھا ہے

کس کے دروازے سے جو چاہے گدا ملتا ہے      اور جو ملتا ہے تو باچون و چرا ملتا ہے  
در بدر بھیجک اگر مانگے کیا ملتا ہے      بے طلب ہیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے  
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

تا ابد اس کو خدا رکھے سراسر سربلندر      اس جہن میں ہے یہ رشک منور سربلندر  
ہو سدا اس کا چمن زار مقدر سربلندر      خضر سلطان کو رکھے خالق اکبر سربلندر  
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

کٹ لے ہیں اسی امید میں مزلے کچھ ن      صرف اسی آسے پہے دل مضطرب سا گن  
یہ تصور جو نہ ہو کب ہے تسلی ممکن !      ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن  
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ہم ہیں شاکی ساقی گلفام کے      اہلِ مخمل ہوں مُحق انعام کے  
 حوصلے پورے ہوں خاص و عام کے      غیر ہیں مخمل میں بوسے جام کے  
 ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

ظلم سے خالی ہے کوئی کِر نہ مر      درپئے ایذا ہیں اہلِ شہر و درہ  
 تم سے کیوں پڑتی مرے دل میں گرہ      خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ  
 ہتکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام کے

دل میں اس ناوک فگن کے ہے گرہ      یہ کمان اپنی کئے رہتا ہے زہ  
 تاک میں سب کی ہے کہ ہو یا کہ مر      خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ  
 ہتکنڈے ہیں چسرخ نیلی فام ہے

تم جوابِ خط ہمیں دو یا نہ دو      ہم کو حاصل ہے غرض ہے دل کی جو  
 اس بہانے نام لکھا جائے تو      خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو  
 ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جوشِ مستی میں کیا طوفِ حرم      خستِ خم پر کی ادا رسمِ سلم  
 زہد میں رندی سے بھی چوکے نہ ہم      راتِ پی زمرم پرے اور صبحِ دم  
 دھوئے دجئے جامہٴ احرام کے

تھی بلا اپنے لئے اپنی نظر ہتکنڈوں کی اس کے تھی کس کو خبر  
 اپنے ہاتھوں خود میں پہنچا ضرر دل کو آنکھوں نے پھنسا یا کیا مگر  
 یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے

ہو چکا ظاہر دعاؤں کا اثر سب تھے مصروف دعا شام و سحر  
 شاد پھرتے ہیں طبیب اور چارہ گر شاہ کے ہے غسل صحت کی خبر  
 دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

پوچھ لو مریز سے اپنا مشغلا شغل ہو سکتا ہے کیا بے کار کا  
 روگ ہی کچھ دل کو بیٹھ بگ گیا عشق نے غالب نکما کر دیا  
 ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

لے مرزا لکھے ”بھائی محمد بن اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی معیبت گزر گئی لیکن بڑھا پے کی  
 شدت بڑھ گئی تمام دن پڑا رہتا ہوں بیٹھ نہیں سکتا ج ضعف نے غالب نکما کر دیا۔“

اسی طرح دہلی سوسائٹی کے جلسے میں اپنا ایک مضمون پڑھا۔ فرماتے ہیں: ”بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں  
 آج اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں“ ضعف نے غالب نکما کر دیا۔“ ربیاض الدین امجد نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں  
 نے یہ شعر ان کے سامنے پڑھا ”عشق نے غالب نکما کر دیا“ تو فرمایا ”بھائی چپ رہو۔ یوں کہو ضعف نے  
 غالب نکما کر دیا۔ یاد ہرنے غالب نکما کر دیا۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔“

مولوی احمد حسن قنوی کو لکھا ”یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہے اہم عشق  
 نے غالب..... ہینسٹہ برس کی عمر ہوئی۔ اضمحلال قوی، ضعف دماغ، فکر مرگ، غم عینی جو مجھے  
 آپ دیکھ گئے ہیں میں اب وہ نہیں ہوں۔“

ہر شجر نے نئی قبا پائی      بوئے گل کو صبا اڑا لائی  
گلِ نرگس نے پائی رعنائی      پھر اس انداز سے بہار آئی  
کہ ہوئے ہر وہ تماشا

ہے صفائیِ سمک سے تار سماک      نظر آتے نہیں خس و فاشاک  
ہر چمن ہے غبار و گرد سے پاک      دیکھو اے ساکنانِ خطہ خاک  
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

اوس کی ہے بہارِ سبزے پر      گل چمکتے ہیں صورتِ اختر  
کہتے بے ساختہ نہ پھر کیوں کر      کہ زمیں ہو گئی ہے سرتاسر  
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

ابرِ باران سے آبیاری کی      قوتِ نامیہ کو حرکت دی  
نظر آتی ہے شاخ شاخ ہری      سبز کو جب کہیں جگہ نہ ملی  
ہو گیا روئے آب پر کائی

سبزِ نخل بچھائی سبزے نے      کھل کھلاتے ہیں ہر طرف غنچے  
پھول کئی شاخ شاخ پر بھولے      سبزۂ وگل کے دیکھنے کے لئے  
چشمِ نرگس ہوئی تماشا

بزمِ عالم ہے مے کرے کی نظیر      جھوم کر چھا گیا ہے ابرِ مطہر  
مست پھرتے ہیں سب صغیر و کبیر      ہے ہوا میں شراب کی تاثیر  
بادہ نوشی ہے بادِ پیائی

شاد مرزا ہے ہر گھڑی غالب      کہ دعا کار گر ہوئی غالب  
عام ہے عیش و خرمی غالب      کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالب  
شاہِ دیندار نے شفا پائی

۱۰۶

نہ چلی سحرِ بیانی میری      ہیچ نکلی ہم سے دانی میری  
بھول کر بات نہ مانی میری      کب وہ سنتا ہے کہانی میری  
اور پھر وہ بھی زبانی میری

درِ دل اسے ستم انگیز نہ پوچھ      حالِ چشمِ غضب آمیز نہ پوچھ  
زخمِ نوکِ مژگ تیز نہ پوچھ      غلشِ غمرہٴ خونریز نہ پوچھ  
دیکھ خوں نابِ رفتانی میری

مجھ کو اپنا ہی نہیں ہائے خیال      دوستوں تک تو کہاں جائے خیال  
کس طرح ان کا مجھے اے خیال      ہوں زِ خود رفتہ بمبیدائے خیال  
بھول جانا ہے نشانی میری

ہے حریف اپنا بھی کتنا بودا مجھ کو جس بزم میں پایا نہ جا  
میری ہر بات میں ضد ہے گویا مشتابل ہے مقابل میرا  
رک گیا دیکھ روانی میری

جبکہ نظروں میں سبک ٹھہرا ہوں کیوں ترسے دل پگراں اتنا ہوں  
کیا حقیقت ہے مری میں کیا ہوں قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں  
سمت اریاں ہے گرانی میری

کیوں نہ سناستہ چکر کھاؤں گردشِ دہر سے ہے حالِ زبوں  
غیر ممکن ہے کہ ٹھہروں دم لوں رگِ دبا د رہے تابی ہوں  
مصرِ شوق ہے بانی میری

موثر گافی کا مجھے دعویٰ تھا عقدہٴ موئے کمر ہی نہ کھلا  
تھا غلط زعمِ ہمہ دانی کا دہن اس کا جو نہ معلوم ہوا  
کھل گئی پہنچ مدانی میری

خط جو لکھتا ہوں تو خاص طور مار بات کرتا ہوں تو دیوانہ وار  
کیا مجھے یاد کریں گے غمِ خوار کیا بیاں کر کے مرا رویں گے یار  
مگر آشفتمہ بیانی میری

اے عبدالرزاق شاکر کے ایک خط میں تشریح کی ہے "تقابل و تضاد کو کون د جانے کا نور و ظلمت شادی و غم راز  
رجح و مرجح و عدم لفظ مقابل اس معنی میں ہے جسے حریف کہہ سکتا ہے دوست بھی مستعمل ہے غم و شغور  
ہم اور دوست ہونے کے خلاف و عادت ضد ہرگز نہیں وہ میری طبع کی روانی کو دیکھ کر رک گیا۔"



مثل مرزا ہوئی طاقت غائب      قلب قابو میں نہ بس میں قالب  
 خاک ہوں زلیست کا اپنی طالب      کر دیا ضعف نے عاجز غالب  
 ننگ پیری ہے جوانی میری

رگ رگ ہے مری نشترِ فساد کی بھوکی      ہو جلد رواں تیغ یہ حسرت ہے گلو کی  
 راحت ہے جراثیم کو روانی کدو کی      جس زخم کی ہو سکتی ہو تند بیرِ فرو کی  
 لکھتے بھوکو یارب اسے قسمت میں عدو کی  
 وہ دن گئے تھیں خون کی جب اپنی گیس پُر      اور آنکھ سے تھانوں کے اشکوں کا قطر  
 خونِ جگر و دل تو ہوا رزقِ نفسِ کر      اچھا ہے ہر انگشتِ حسائی کا تصور  
 دل میں نظر آتی تو ہے اک بوندِ لہو کی  
 ناحق ہے قیامت کا تھیں خوف ابھی سے      کچھ ظلم بھی کرتے ہو تو سہمے ہوئے جی سے  
 کرنے دو اگر کرتے ہیں شکوہ یہ کسی سے      کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے جوصلگی سے  
 یاں تو کوئی سنتا نہیں فریادِ کسو کی  
 جب نہ کیا ہو ترے تیروں نے ادھر کو      کاٹنا نہ ہو شمشیر نے سودا بھرے سر کو  
 کیا لطف ملے زلیست کا پھر ایسے بشر کو      دشمن نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو  
 خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی

مرزا غم دنیا سے رہا موت کا طالب      چاہا کہ کرے ترک کہیں جان یہ قالب  
حاصل ہوا مطلوب نہ برائے مطالب      صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب  
حسرت میں رہے ایک بتِ عبرتِ جو کی

(۱۰۸)

حسن ہی کا دل کو سودا چاہیے      اشتیاقِ روئے زیبا چاہیے  
رات دن شوقِ تمنا چاہیے      چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے  
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے  
نشر ہوتا ہے کب ان کو اس قدر      کچھ نہ ساقی کے سوا اے نظر  
لاکھ یہ پیتے رہیں آٹھوں پہر      صحبتِ زنداں سے واجبِ حذر  
جائے اپنے کو کیسینا چاہیے  
پاکے شرہ چاہ کا دل ہے خجل      ہو گیا ہے درد و غم سے مضحل  
اب تو یہ سہ اور دردِ جاں گسل      چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل  
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے  
مجرموں نے پردہ ہے دیوانگی      یہ تنہا فراور یہ ہم خانگی  
ہم سے چھپنا ہے کوئی فرزانگی      دوستی کا پردہ ہے بے گانگی  
منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

موت کا پاتا ہوں جو یا غیر کو      رشک نے میرے ڈھویا غیر کو  
رات دن کا غم ہے گویا غیر کو      دشمنی نے میسری کھویا غیر کو  
کس قدر دشمن ہو دیکھا چاہیئے

پند میں نا صبح نے بھی کر لی ہے سعی      قید سے یاروں نے کیا کم کی ہے سعی  
بار بار ہم نے بھی کر دیکھی ہے سعی      اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی  
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیئے

کب ہے مایوسوں کو امید نوید      گوش زد ہوان کے کیونکر یہ نشید  
کچھ نہ پوچھو حسرتوں کا اپنی بھید      منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید  
نا امید کی دیکھا چاہیئے

پیرزن نادم تھی اپنے قصہ سے      منہ تنہا کیا اس کا کروہ یوسف کو لے

۱۔ غالب صاحب نے مثنوی ہی بخش حقیر کو اور جنوری ۱۹۵۸ء کے خط میں لکھا ”کیا کروں؟ مفت غمزہ اور  
طول رہتا ہوں۔ مجھ کو اب اس شہر کی اقامت ناگوار ہے اور موانع و عوائق ایسے فراہم ہوئے ہیں کہ نکل نہیں سکتا  
خلاصہ میرے رنج و الم کا یہ ہے کہ میں صرف مرنے کی توقع پر جینا ہوں۔“

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید      نا امید کی دیکھا چاہیئے  
یہ شعر مرزا یوسف کو بھی ایک خط میں لکھا ہے علاوہ انہیں چودھری عبدالغفور کے خط میں ضاع الم بارہوی  
کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے ”حضرت پرچ تو یوں ہے کٹم ہائے روز گار نے مجھ کو گھبرایا ہے سانس نہیں لے سکتا  
اٹانگ کر دیئے ہر باب کو طرح سے خیال میں آئی پرل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب باتیں سوچتا ہوں ایک تیر کہ  
جب تک جیتا ہوں یوں ہی رویا کروں گا دوسری یہ کہ آخر ایک نہ ایک دن مرنے لگا یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہے تیرا سکا  
سکھن ہے، یہ بات۔“ منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید : نا امید کی دیکھا چاہیئے۔“

آ رہی تھی یہ صدائے غیب اسے      غافل ان مرہ طلعوں کے واسطے  
 چاہنے والا بھی اچھا چاہیے  
 یہ ضعیفی اور تلاشِ خال و خد      جستجوئے نازنینِ سرو قد  
 اس جنوں کی بھی ہے مژا کوئی حد      چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد  
 آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

۱۰۹

کس طرح طے ہو رہا عالمِ امکان مجھ سے      میں تھکا ماندہ ہوں اور دوسرے جاناں مجھ سے  
 ذرہ ذرہ دم و حشر ہر گریزاں مجھ سے      ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے  
 میری رقتاں سے بھاگے ہے باباں مجھ سے  
 جبکہ دیباچہ سے کھلتے ہیں مضامین یکے      پھر یہ فرصت ہے کسے بیٹھ کے دیکھے دفتر  
 اور ہیلام میں الجھی ہوئی ہے اپنی نظر      درکِ عنوانِ تماشا بہ تغافلِ خوشتر  
 ہے نگہ رشتہ شیعہ ازہ شرکاں مجھ سے  
 کیا کہوں کیسے بسر ہوتی ہیں غم کی راتیں      میرے سادہ بیاں کی مجھے تکلیف نہ دیں  
 بیکیسی کامری اندازہ اسی سے کر لیں      وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں  
 دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے  
 میرے نام میں وہ جب ٹھہرے گریاں      پھر خود آرائی و زینت کا وہ سامان کہاں

مٹ گئی سرمہ کی تخییر کہ میں شک وں غم عشاق نہ ہو سادگی آموز بتاں

کس قدر فائدہ آئینہ ہے ویراں مجھ سے

چونکہ ہے درشت مے پاؤں سے آغشتہ نچل ڈسے ڈسے کو یہ دعویٰ ہے کہ میں فخر ہوں

کیوں چمکتے ہوئے چھالوں کو جو اہرنہ کہوں اثر ابلے جاوے محسراے جنوں

صورتِ رشتہ نگہ ہرے چراغاں مجھ سے

کاش ہر اک شب غم میں یہی بے ہوشی ہو تاکچہ آرام سے یہ ہوش باگزسے تو

اس نے تو خوب ہی پہنچائی ہے راحت دلکو بے خودی بستر تمہید فراغت ہو جو

پڑے سایہ کی طرح میرا شبستان مجھ سے

منہر قفل پہ ہیں آنکھ کے ارماں سارے کٹے ستریز نظر ہو تو کروں نظائے

تبع گل گیر سے کم مجھ کو نہیں ہے پیاسے شوق دیدار میں گر تو مجھے گزن مائے

ہونگے مثل گل شمع پریشناں مجھ سے

کیا شبِ تانے ڈھائی ہے قیامت ہے چھوڑ دی سایہ نے بھی میری رفاقت ہو

کتنی پر خوف ہے منزل گہرِ فرقت ہے بیکی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے

سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے نہاں مجھ سے

بادِ حسن سے بغیر و نیک تو یوں مست کرے تشنہ لبہ رہی دیدار کے جو طالب تھے

خوب انصاف کیا ساقی دہوش تو نے گردشِ ساغرِ صدِ جلوہ رنگیں تجھ سے

آئینہ داری یک دیدہ حیراں مجھ سے  
 آگ وہ سید نہ زائیں بھڑکتی ہے آئندہ  
 دل میں بھی آتش جاں سوز دہکتی ہے آئندہ  
 دیکھ کر برق جسے دور کرتی ہے آئندہ  
 نگہ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے آئندہ  
 ہے چراغاں خس و فاشاگِ گلستاں مجھ سے

۱۱۰

دل میں وہ درد کو اکود دکھائے نہ بنے  
 حال اپنا وہ زلوں جسکو چھپائے نہ بنے  
 بار غم میں وہ گرانی کا اٹھائے نہ بنے  
 نکتہ چیں ہے غمِ دل اسکو سنائے نہ بنے  
 کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
 گو بظاہر نہیں کچھ اس کا بلانا مشکل  
 ڈر مگر یہ ہے کہ ہٹ میں ہے وہ اپنی کامل  
 کہیں ہونا نہ پڑے اسکے نہ آنے سے خجل  
 میں بلاتا تو ہوں اسکو مگر اسے جذبہ دل  
 اس بر بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے  
 لذتِ حیر و جفا کو کہیں وہ شوخ نہ پائے  
 فصدِ چڑھ جائے کہیں ایسی کہ بھڑل نہ دکھائے  
 ہاتھ دانستہ کہیں ظلم سے ظالم نہ اٹھائے  
 کھیل سمجھا کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے  
 کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے  
 خود تو رسولے جہاں ہر ہی یہ بد ذات مگر  
 نیک نامی کو کہیں تیری نہ پہنچائے ضرر  
 راز داری کے کہتے ہیں اسے کیا خبر  
 غیر بھڑتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر

کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے  
 « شاخ ہی تنگ ہے گل تر کا شکفتہ رہنا ہاتھ نکلی چلیں کا پڑا اور وہ پڑ مردہ ہوا  
 چشم بد دور وہ نازک میں کہیں گل سے سوا اس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا  
 ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے  
 نور یہ ہر میں یہ مہ میں ضیا کیسی ہے کس کی بو ہر گلِ نو خاستہ میں مخفی ہے  
 ہر طرف طرف تماشاے نظر بندی ہے کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے  
 پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے  
 غم سے گھل کر طرود لے اشکوں میں ہے میں نے اب تک تو تم وعارہ خلا فی کے ہو  
 منظر کیوں ہوں تمہارا کوئی اب لاکھ کہے موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بنائے نہ ہے  
 تم کو چاہا ہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

۱۔ اس شعر کی تشریح غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح لکھی ہے ”بھائی مجھ کو تم سے بڑا تعجب ہے کہ اس  
 بیت کے معنی میں تم کو تا مل رہا اس میں دو استقام آ پڑے ہیں کہ وہ بطریق طعن و تعریف معشوق سے کہے گئے ہیں  
 موت کی راہ نہ دیکھوں۔ کیوں نہ دیکھوں؟ میں تو دیکھوں ہی گا کہ بنائے نہ ہے کیونکہ موت کی شاخ میں سے یہ  
 بات ہے ایک دن آئے ہی جی انتظار ضائع نہ جائے گا۔“

تم کو چاہوں، کیا خوب کیوں چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے یعنی اگر تم آپ سے آئے تو آئے اور اگر نہ  
 آئے تو پھر کیا حال کہ کوئی تم کو بلا سکے گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق  
 ہوا ہوں۔ اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے بغیر آئے نہیں رہتی تم کو کیوں چاہوں کہ اگر نہ آؤ تو تم کو بلا نہ سکوں۔“  
 یہ غزل غالب صاحب نے منشی نبی بخش حقیر کو اس غزل کے ساتھ جس کا مطلع ہے  
 کہتے تو ہو تم سب کہ بہت غالب تو آئے اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ ”وہ آئے“

اس سال کی تھی۔

ہیں برے بیچ میں تقدیر سے ہم آگے ہوئے      بات بنتی نظر آتی نہیں تذبذبوں سے  
کر دیا ہے ہمیں مجبور بہت قسمت سے      بوجھ وہ سر سے گرا ہے کاٹھائے نہ اٹھے

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے  
عشق کی خاک کرے کوئی ستائش غالب      الاماں قہر ہے اس برق کی تابش غالب  
بارہا کی ہے یہ مزلے گزارش غالب      عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آیا مزا کو جسے دیکھتے ہی غش غالب      تم نے دیکھا نہیں وہ شعلہ کمرش غالب  
بابا الفت میں عبت تم ہو مشوش غالب      عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب  
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے



شبِ فراق میں لحت وہ بے صاف ہے      لگی ہر آگ جو سینہ میں اس کو آب تو دے  
نجات غم سے وہ پڑھ نہیں شتاب تو دے      وہ آگے خواب میں تسکین اضطراب تو دے  
وے مجھے تپشِ دلِ مجالِ خواب تو دے  
جوابِ غیظ و غضب سے ہر ایک کو دینا      ہر ایک کن میں دونوں جہاں سو کھود دینا  
وہ بھر کے سانس جگر میں چھری چھود دینا      کرے ہے قتلِ رگاوٹ میں تیرا رو دینا  
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے  
لے حاشیہ ص ۲ پر



لنگے منہ سے عطا کوئی جام کریم کو      امیدوار نہ یوں صبح و شام کریم کو  
جواب تلخ ہی سے شاد کام کریم کو      دکھائے جنبش لب ہی تمام کریم کو  
نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے

خیال چھوٹ سے بچنے کا ہے نہ عادت ہے      نہ اجتناب کسی سے نہ کچھ عداوت ہے  
ہمیں سے اک تجھے پرہیز اور کراہت ہے      پلائے اوک سے ساقی جو ہم ک نفرت ہے  
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

شب اسکی بزم سے اغیار یوں ملول گئے      کہ پاؤں ٹھگئے اور چو کڑی وہ بھول گئے  
قبول خدمت مزا ہوئی وہ غول گئے      اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے  
کہا جو اس نے مے ہاتھ پاؤں داب تو دے

حاشیہ ص ۲ کا۔ اس غزل کے بارے میں مرزا علاؤ الدین کو بڑے قلق کے ساتھ لکھا ہے پچاس برس کی بات ہے کہ انہی شخص خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی میں نے حسب انکم غزل لکھی۔ بیب الغزل یہ ہے پلائے لوک سے ۱۰۰ اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے نکھ کر اس مطلع اور اس بیت الغزل کو شامل ان اشعار کے کر کے غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں مطلق اور ایک شعر میرا اور پانچ شعری اتو کے .... جب شاعری زندگی میں گائے والے شاعر کے کلام کو مستخرج کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے غلط کر دیا ہو۔

اس مطلع سے متعلق ایک لطیفہ بھی ہو سکتا ہے غالب صاحب ایک مرتبہ پٹنگ پر پڑے ہوئے کراہے تھے۔ مہر مہری پاؤں دبائے لگے غالب صاحب نے کہا بھئی تو سید زادہ ہے مجھے کیوں گناہ گار کرتا ہے۔ انھوں نے مانا اور کہا ”آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میرا بے کی اجرت دیتے تھے“ غالب صاحب نے کہا ”ہاں اس کا مضائقہ نہیں“ جب وہ پیراب چلے تو اجرت طلب کی۔ غالب نے کہا ”بھئی کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دبائے میں نے تمہارے پیسے دے دیے“

ادھر نہ گفتہ بہ حال ہوں و خوارِ بستر ہے      ادھر مجھے تن خود میسے حق میں خارِ بستر ہے  
دلِ بیتابِ مضطرب باعثِ آزارِ بستر ہے      تپشِ میری وقفِ کشمکش ہر بارِ بستر ہے

مرامِ رنجِ بالش ہے مرا تنِ بارِ بستر ہے

حقیقتِ اشکِ اور ل کی تم سہ کیا کہیں ہے      مگر ہاں محقر سن لو کہ وہ کیا شے ہے یہ کیا شے  
ہمائے نازِ پردوں میں ہیں و نونِ راک ہے      سرخِ سبِ صحرادادہ نورِ العینِ امن ہے

دلِ بے دستِ پُراقتادہ بر خوارِ بستر ہے

نہے قسمتِ کرم یوں بے بلائے میسے گھر آؤ      مے بیتِ الحزن کے جاگ اٹھے نہ نصیبِ ابتو  
مرضِ کا اپنے بڑھ جانا مبارک ہو گیا مجھ کو      خوشا اقبالِ بخوری عیادت کو تم آئے تو

فروغِ شمعِ بالیس طالعِ بیدارِ بستر ہے

ہوا اندھیر گھر میں کیا بلا وقت کی رات تھی      در و دیوار پہ کس غضب کی تیرگی چھائی  
مگر ہاں گھر: بستر کی بدلت روشنی پائی      بہ طوفانِ گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی

شعاعِ آفتابِ صبحِ عشرتِ بارِ بستر ہے

خدا کا شکر ہے تقدیر ہے جاگی ہوئی اپنی      پھر اسکے خواب میں آنی کی حسرتِ یوں بین ہوئی  
بتائیں کیا ابھی کل ہی تو وصلِ یار کی شب تھی      ابھی آتی ہو بالش سے سکی زلفِ مشکیں کی

ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

ہوا ہے مبتلا مرزا عجب آزار میں غالب رہا کچھ بھی نہ باقی اسکی جانِ ناز میں غالب  
 نہیں ٹھٹھنے کی بھی طاقت آنکھ میں غالب کہوں کیا دیکھی کیا حالت ہر بحرِ یار میں غالب  
 کہ بے ثباتی سے ہر اک تارِ بسترِ خارِ بستر ہے

۱۱۳

بہی ہوا باتِ اینک تو کہیں اُن یں نہ ہو جائے محبت کی جگہ نفرت تجھے پُرفتن نہ ہو جائے  
 رہا غرہ تو میرِ نفس ہی رہن نہ ہو جائے خطر ہے رشتہ الفتِ رگِ گردن نہ ہو جائے  
 غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے  
 کمالِ فصلِ گل کہتے ہیں سکو مرزا غالب کہ ہو ہر ہر شجر پہنے ہوئے گل کی قبا غالب  
 سرگلبن کھلیں دو چار گل تو کیا مرزا غالب سمجھ اس فصل میں کوتاہی نشوونما غالب  
 اگر گل سرو کے قامت پہ پیرا یں نہ ہو جائے

۱۱۴

کیا جانے اصول ہے نہیں ہے آہنگ بھی کوئی طے نہیں ہے  
 باقاعدہ کوئی شے نہیں ہے فریاد کی کوئی لے نہیں ہے  
 نالہ یا بندِ لے نہیں ہے  
 گلشن کو غرض نہیں جو سے کیا معنی ہیں پھر کہنے کے

کشکول کا کام کیا نہ لیں گے      کیوں بوتے ہیں باغباں تو بنے  
گر باغ گدائے نہیں ہے

جود تیرا ہی چار سو ہے      ہر ایک کو تیری جستجو ہے  
تجھ سے ہی گلوں میں رنگ و بو ہے      ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے  
پر تجھ کی تو کوئی شے نہیں ہے

بے جا بے خودی و خود پرستی      ایک وہم و خیال ہے یہ بستی  
لاشے بے یہ اوج اور پستی      ہاں کھا میو مست فریب ہستی  
ہر چند کہیں کہے نہیں ہے

پیوستہ ہر ایک شے بے ضد ہے      ہوتی ہے نشاط بعد غم کے  
خواہاں بے اگر الم سے چھوٹے      نشادی سے گزر کہ غم نہ ہوئے  
ار دی جو نہ ہر تو دے نہیں ہے

کچھ وہم مگر تجھے ہے زاہد      انکار شراب سے ہے زاہد  
ملتی یہ شے کسے ہے زاہد      کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد  
مے ہے یہ نگس کی قے نہیں ہے

مرزا ترا ہم قدم ہے غالب      دھیان اس کو یہ دمدم ہر غالب  
دم کہتے ہیں جس کو دم ہے غالب      ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب  
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

کچھ رشک قیبوں ہی سے تنہا نہیں کرتے      اپنی بھی نظر سے انھیں دیکھا نہیں کرتے  
جان لے جو لب پر بھی تو پروا نہیں کرتے      ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے  
مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

وہ غیر جو کہتے ہیں یہ کہنا ہے زبانی      لیکن ہے رقیبوں سے رکاوٹ کی نشانی  
ہم سے کوئی آسان ہویوں بات بنانی      درپردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی  
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پروا نہیں کرتے  
قابو نہ کسی شخص کا تم پر ہے نہ بس ہے      مانو تو یہ مرزا کی نصیحت تمھیں بس ہے  
باز آؤ اگر مہر و وفا سے تمھیں مس ہے      یہ باعثِ نومیدِ اربابِ ہوس ہے  
غائب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

مرے سببِ یخستہ فلک ہے کیا کیئے      غریب کشتہ تیغِ نظر ہے کیا کیئے  
فریبِ حسن سے یہ بے خبر ہے کیا کیئے      دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کیئے  
ہو ارقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کیئے

اے غالب صاحبِ منشی ہی بخش حق کو گنہگار بھائی یہاں بادشاہ نے قلعہ میں مشاعرہ مقرر کیا ہے ہر پہنچے میں دو بار  
مشاعرہ ہوتا ہے پندرہویں کو اور انیسویں کو حضورِ قادری کا ایک مصرع اور بیچنے کا ایک مصرع (باقی ص ۱۱۷ پر)

بدن سے جان کی طرح جائے بن نہ رہے      فراق جسم کا صدمہ اٹھائے بن نہ رہے  
مگر ہیں تو یہ پھر بھی ستائے بن نہ رہے      یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے  
قضا سے شکوہ ہیں کس قدر ہے کیا کہیے

ضرور ہے کوئی موجودگی کا اسکی سبب      اسی گوشت میں پایا وہاں گئے ہم جب  
کچھ اور نقل ہی اس کو نہیں ہے روز و شب      ہے یوں گویا نگاہ کے کوئے دوست کو اب  
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہیے

ہم آئے سر پہ تھا جنتک شباب کا اسیدب      نہ راہ عشق کا سو جہاں بھی فراز و نشیب  
اس اک گمان سے حاصل نال کو صبر و شکیب      نے کرشمہ کہ بوں نے رکھا ہے ہم کو فریب  
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

ہم آئے درد و الم کا ہوا کہ ان کو خیال      بلا کے گھر کبھی پوچھی نہ وہ رنج و ملال  
وہ بے بچہ نہیں یہ بچہ ہے ایک ان کی چال      سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ سپریش حال  
کہ یہ کہے کہ سر رہ گزر ہے کیا کہیے

تمھارے انس و محبت کا رنج و غم احوال      کہ بات بات میں ہر دو مستوں رنج و ملال  
تخصیص سے ہم کی اگر ہوں تو پر نہاہ حال      تمھیں نہیں ہے سر رشته وفا کا خیال

بقیہ ص ۲۰ کا مطلق کرنے پر اب تادی التادی کی تیسویں کو جمعہ مشاعرہ ہوا کہیں مصرع فارسی یہ تھا کہ  
زین تماشا گاہ گرماں می رود۔ یہی مصرع یہ تھا کہ جماعت حق ہوں کہ نہ دے کیا کہیے۔ نظر ہے کیا کہیے خبر کیا کہیے۔  
میں نے ایک غزل ندر کی اور ایہ ریہ موافق طرح کے اور دو سلاخیہ ای طرح میں سے ایک اور صورت  
ذکاں کر لیں وہ تینوں غزل میں تم کو کھنا ہوں یہ طرح لینا اور میان تفتہ کو بھی دکھالینا۔

ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کیئے  
 کبھی کیا بھی جو کچھ عرض حال دل ہم نے  
 تو مسکرا کے کہا کیوں ہوئے ہو دیوانے  
 فضول ہو جائے ہر وقت دو بدوان سے  
 انہیں سوال پر زخم جنوں ہے کیوں لڑیئے  
 ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کیئے  
 کسی کو ہم سے اگر رشکِ فن ہے کیا کیئے  
 حسد کی آگ اگر شعلہ زن ہے کیا کیئے  
 جہان کی یہی رسم کہن ہے کیا کیئے  
 حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیئے  
 ستم بہالے متاعِ ہنر ہے کیا کیئے  
 کٹے جہان میں مژدہ مشکل اس کے دن  
 نہزار عیب لگاتے ہیں اس کو بد باطن  
 بُرا بُرا اسے کہتے ہیں سب جوان و مسن  
 کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں لیکن  
 سوائے اس کے کہ آشفۃ سر ہے کیا کیئے

جب تلک آزاد تھا کب تھی پریشانی مجھے  
 کچھ بچ کر زنداں میں لائی میری جولانی مجھے  
 تخی عدم میں ہر طرح حاصل تن آسانی مجھے  
 دیکھ کر در پردہ گرم دامن انشانی مجھے  
 کر گئی وابستہ تن میری عربانی مجھے  
 یوں مرا سینہ دہائے وہ مری قسمت کہاں  
 اور کیا اسکے سوا ہے خوش نصیبی کا نشان  
 اور گلے پر اس کے ہاتھوں سے ہولیوں خجرواں  
 بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں

مرحبا میں۔ کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

رات دن اتنے اسکا تصور پے بہ پے مجھ کو عرض حال میں مانع نہیں بھر کوئی شے  
ہوں سی دھن میں ہی مجھ کو لگی رہتی ہے کیوں نہ ہو بے التفاتی اس کی خاطر جمع ہے

جانتا ہے جو پرستہاے پہنانی مجھے

میری بربادی تو قدرت نے مقدر کی ہی تھی اس پر طرہ یہ ہوا گھر کی بلا سر پڑ گئی  
یہ ہوئی اچھی عنایت کاتب تقدیر کی میرے غم خانے کی قسمت جب تم ہونے لگی

لکھ دیا منجملہ اسباب ویرانی مجھے

ملتی جلتی ہے فغاں اسکی مری فریاد سے شوق سے سنتا ہوں اپنا ہم نوا پا کر اسے  
ڈال رکھا ہے پریشانی میں اسکے وہم نے بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے

اس قدر ذوق نوائے مرغِ بستانی مجھے

چرخ کے ہاتھوں پہ پایا چین میں جب تک حیا داؤں جب اس کا چال کچھ ہی مجھ پر کیا  
تنگ آکر زسیت سے جامِ اہل آخر پیا وائے واں بھی شورِ مٹرنے نہ دم لینے دیا

لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

بہ رقیبِ روسیہ یوں ہی اگر دمسائے جھوٹ پر رغبت دلائیگا کہ تو دوبار ہے  
منتظر رکھنا کسی کو یہ بھی کوئی ناز ہے وعدہ آئے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سوچی ہے میرے گھر کی دہانی مجھے

چاہئے بھائی سے یوں بھائی کو مرزا دوستی ہو جو اس کو خیر تھی تو خیر تھی ہو اس کو بھی



جس طرح غالبؔ کی اس شعر میں ظاہر ہو چکی  
دی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی  
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسف ثانی مجھے

۱۱۸

خود فراموشی ہوئی وقتِ مسرت کب مجھے      دل ہی جنال ہو پھر فرحت کیا مطلب مجھے  
لب پر اس کا نام تھا کچھ درد پہنچا جب مجھے      یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے  
بسوزِ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

کہہ گیا دل رفعِ دل سے ہو گیا رنج و غم      کر رہا ہے پرسشِ احوال ہر غمچہ دہن  
باتِ نجائی پر ہوتا ہے جو کوئی حرفِ زن      ہے کشادِ خاطر و البستہ در رہن سخن  
معا طلسمِ قفلِ ابد خانہٴ مکتب مجھے

اک طرف چپکا پڑا تھا کیا نے زنداں میں تھے      کیوں نہ آئیں یادِ رہ کر وہ ن آرام کے  
دہلتِ ابدِ م بھر نہیں آوارگیِ دشت سے      یارب اس استغنیٰ کی داؤد کس سے چاہیے  
رنگِ اسلش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

راتِ بستی بڑا نکسوں والا ک جوئے خوں      حالِ دل بھی ہو گیا ہے کثرتِ غم سے زبوں  
عمر گزی ہو کر میل اس ذوق کا فکروہ ہوں      طبع ہے مشتاقِ لذتِ ہائے حسرت کیا کرو  
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

جھوٹے فرماتے تھے طنز کیوں تم ایسے ہو گئے      کیا ہوا مژدہ تمہیں دیوانے کس کو ہو گئے

اب تو صرت کیلئے موزوں یقرب ہو گئے      دل لگا کر آپ بھی غالب مجھ سے ہو گئے  
عشق سے آتے تھے مانع ہیرا صاحب مجھے

کمالِ علم اہلِ انجن کی آزمائش ہے      ہنر کا امتحاں ہے اہل فن کی آزمائش ہے  
ہراکِ نو مشق و مشاق کہن کی آزمائش ہے      حضورِ شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے

چمن میں خوشنویاں چمن کی آزمائش ہے  
معن میں ہر گرفتارِ معن کی آزمائش ہے      گداز و سوز میں شمعِ لگن کی آزمائش ہے  
قفس کی قید میں رخِ چمن کی آزمائش ہے      قد و گیسو میں قیس و کوہن کی آزمائش ہے  
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کہیں یسا نہ ہو محنت ہو اسکی رائیگاںِ آخر      نہ جوئے نول ہو جوئے شیر کے بلے رواںِ آخر  
غمِ شیریں ہے گا کس طرح وہ نیم جاںِ آخر      کریں گے کوہن کے حوصلے کا امتحاںِ آخر  
ہنر اس خستہ کے نیرے تن کی آزمائش ہے

سنا ہے اس نے کہ یعقوب کی آہ بھر گاہی      سنگھار بوئے یوسف اسے کب اسکی خوشی چاہی  
ہوئی چراہی مطلب کے کفال کی نظرِ آہی      نسیم مصر کو کیا پیر کنعاں کی ہوا خواہی  
اسے یوسف کی بوئے پیر بن کی آزمائش ہے

یہ کیا کرتے ہو تم ضبط و تحمل کے غلط دعوے      یقین جاؤ کہ ہوشِ راجائیں جب سکو دیکھو گے

جسے دعویٰ ہوا اہل بزم میں بے سبب و سبب سے  
وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کرا غافل تھے

شکیب صبر اہل انجن کی آزمائش ہے

نشانے دو ہیں جسکو بھی ارادے اسکا تیرا کر  
تو پھر شک وارانہ بازی میں اسکی کیجئے گنو نکر  
کماں کو کھینچنا ہی اسکا اک احسان ہر دم پر  
ہے دل ہی میں تیرا چھارہ جگر کے پار ہو بہتر

غرض شہست بت ناوک فلن کی آزمائش ہے

بظاہر تو یہ دونوں ایک ہی بت کہیں دانی  
مگر رم پرستش مختلف دونوں ٹھہرائی  
عبث گردن ہر اک زشتہ الفت میں ٹھہرائی  
نہیں کچھ سحر و زنا رکے پھندے میں گیرائی

وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

نتیجہ نا شکیبائی کا آخر کیا ہے لے غافل  
ترپنے سے کہیں آسان ہو سکتی ہے مشکل  
نہ ہو جائے کہیں تجھ پر کوئی تازہ بلانا زل  
بڑا رہ لے دل ابستہ بیتابی کو کیا حاصل

مگر پھر تاپ زلف پر شکن کی آزمائش ہے

ہمارا قصد تھا کھیں کسی نہ بھی اس کو  
مرہ لینے نہ پائے خود بخود گھٹنے لگے ہم تو  
زباں کا ذکر کیا اسکا اثر آگے تو بڑھنے دو  
رگ و پے میں جیتنے رہم تب دیکھئے کیا ہو

ابھی تو تلخی کام و دہن کی آزمائش ہے

سنا تو ہے انھوں نے ارادہ کر لیا غالب  
کہ وہ مرزا کو بانڈھیں عہد ہیمان فا غالب  
مگر اب دیکھئے یہ چرخ لائے رنگ کیا غالب  
وہ آئینے مے گمر، وعدہ کیسا، کھینا غالب

نئے فتنوں میں اب جہر خ کہن کی آزمائش ہے

اگر وہ روٹھنا ہو گا کتنا جائے ہر مجھ سے  
سرمہ مل بھی جاتا ہے تو کنیا جائے ہر مجھ سے  
غرض جتنا بناتا ہوں بگڑتا جائے ہر مجھ سے  
کبھی نیکی بھی اسکے جی میں گرا جائے ہر مجھ سے  
جفا میں کر کے اپنی یاد تیرا جائے ہر مجھ سے

نظر آتا ہے خواب وصل تو تعبیر لٹی ہے  
بگڑتا ہے بنگر کام کیا تقدیر لٹی ہے  
مرے سب کام لٹے ہیں مری تدبیر لٹی ہے  
خدا یا جذبہ دل کی مرے تاثیر لٹی ہے  
کہ جتنا کھینچتا ہوں وہ کھینچتا جائے ہر مجھ سے

اسے کیونکر سناؤں حال دل پر سخت حیرانی  
پریشانی کا مضمون و ربیاء میں پریشانی  
کھلائے دیکھئے کیا گل میسے قاصد کی ندوانی  
وہ بدخوا اور میری داستان عشق طولانی  
عبادت محقر قاصد بھی گھبرا جائے ہر مجھ سے

یہ میری سرگزشت ان کیلئے جھوٹی کہانی ہے  
انہیں سننے کو نفرت پر یہاں طلی سانی ہے  
مجھے دشوار اپنے دل کی کیفیت سنانی ہے  
ادھر وہ بدگمانی ہے ادھر یہ ناتوانی ہے  
نہ پوچھا جائے ہر ان سے نہ بولا جائے ہر مجھ سے

ہماری زلیست امید تصور کی بدولت ہے  
قضا کا سامنا ہو کیا بلا ضعف و نقاہت ہے  
خیالی زندگی پرور نہ کیا جینے کی صورت ہے  
سنبھلنے دے مجھے ناامیدی کیا قیامت ہے  
کہ داماں خیالی یا رچھوٹا جائے ہر مجھ سے

گوارا دل کو یک پر کر دیکھیں سکو انس جن      تقاضا رشک کا یہ ہے وہ آنکھوں میں ہو سکن  
 وہ جب جلوہ نما ہو گا تو ہو گا حشر کا وہ دن      تکلف بر طرف نظارگی میں بھی بھی نہیں  
 وہ دیکھا جائے کب ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

بمچھ کھاتھیں نے عشق کو اک لنگی دل کی      کہاں کی دل لگی یہ تو مصیبت پڑ گئی ابھی  
 خبر کیا مجھ کو اس کی معرکہ آرائیوں کی تھی      بچے ہیں پاؤں ہی پہلے برد عشق میں زخمی  
 نہ بھاگا جائے ہر مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

مجھے آتا ہے یہ خواب پریشاں کیا نظر غالب      بنے گی دیکھئے کسی دل بیتاب غالب  
 نہ کیوں اس شکست ہونوں مرزا کا بلکہ غالب      قیامت ہر کہ ہوئے مدعی کا ہم سفر غالب  
 وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہر مجھ سے

(۱۲۱)

گردش میں جو ہے گنبد خرامے آگے      فانوس خیالی کا ہے نقشامے آگے  
 ہے ارض کو اک گیند کا رتبہ آگے      بازیچہ اطفال ہے دنیا مے آگے  
 ہوتا ہے شب و روز تماشا مے آگے

اک بلبہ ہے گنبد گرداں مے نزدیک      دُکے سے بھی کتر ہے بیاباں مے نزدیک  
 ہے شعبہ نیرنگی دوراں مے نزدیک      اک کھیل ہے اورنگ سلجاں مے نزدیک

اک بات ہے اعجازِ مسحامے آگے

عواض ہیں اوہام تو اجسام ہیں مستور  
جز نام ہی نام انکا حقیقت کہیں سب دور  
ہر رنگ میں موجود ہے صرف ایک وہی نور  
جز وہم نہیں ہستی اشیاء مرے آگے

اڑتا ہے بیابان کا خاکا مرے ہوتے  
اٹھتا ہے بگولے پہ بگولا مرے ہوتے  
اشکوں سے ہر سیلاب کا نقشہ ہوتے  
ہوتا ہے نہاں گرد میں محراب ہوتے  
گھستتا ہے جبین خاک پہ دریا مرے آگے

دیکھ تو کوئی دل کا ٹرنا ترے پیچھے  
کیا کیے گزر جاتی ہے کیا کیا ترے پیچھے  
جینا مجھے دشوار ہے گویا ترے پیچھے  
منت پوچھ کہ کیا حال ہر میرا ترے پیچھے  
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

حاشیہ ص ۲۱۳ کا :- اور ایک سلیمان حضرت سلیمانؑ کا تھ حضرت سلیمانؑ ایک بیگز گزے ہیں۔ انکی بادشاہت  
بنی نوعان سال برہی رہتی مگر تہذیب و تمدن اور حوں پر بھی انکی فکر مسمعی اور حوں کی مدد سے انکا تخت ہوا مل رتا تھا  
اعجاز کیا۔ عیسیٰ کے معجزے حصر مسمعی ایک۔ عجز نے انکے معجزے اور کمالات بہت تھو ہیں۔ انکا ایک  
معجزہ یہ بھی تھا کہ وہ اپنی بیھونک سے مودول کو زندہ کر دیا کرتے تھے

سلیمان کا تھ میرے رو دیک ایک کھیل کی حیثیت رکھتا ہے اور حضرت عیسیٰ کا معجزہ میرے آگے ایک  
معمولی کی باس ہے یعنی شاہانہ توکس اور بیگز نہ معجزے میری نظر میں کچھ بھی نہیں ہیں۔  
اس غزل کے متعلق منشی نسی محسوس تھیر کو لکھتے ہیں در بامرے آگے، صحرارے آگے اس پر بھی ایک سال گزر چکا ہے  
فلاح مبارک کے شاعرے کی غزل ہے یہ دلچسپ اور دلچسپ اس تمہید کے ساتھ بھی ہے۔

منگل کے دن صبح کو شاعرے فلاح مبارک اور شہر کے دیوان خاص میں متوج ہوئے حضور اقدس اعلیٰ برآمد اور  
جلوہ فرمائے تخت ہوئے۔ جناب حضرت ولی عہد بہادر زبیر افرائے کرمی اور مرزا مغل بہادر اور مرزا خضر سلطان  
بہادر اور مرزا حواں تخت بہادر اور شہزادگان والا تبار بعد باریابی بحر حسب الحکم قصاؤام شریف شمس (باقی ص ۲۱۵)

ہوتا ہوں میں جس وقت سے ناب سرشار اٹھے ہیں تجابات عیاں ہوتے ہیں اہلار  
ہے نشہ سے وابستہ گہر ریزی افکار پھر دیکھئے اندازِ گل افشانیِ گفتار  
رکھ دے کوئی پیمانہ و مہیا مرے آگے

رہتا تھا شب و روز اسی بات پہ جھگڑا ذکر اس کا کرے کوئی مجھے کب تھا گوارا  
اب لاکھ کوئی ذکر کرے کچھ نہ کہوں گا نفرت کا گماں گزرتے ہیں رنگ سے گزرا  
کیوں کر کہوں لو نام نہ اس کا مرے آگے

اسلام ہو مانع جو مجھے دوڑ کے لے کفر ہر چیزِ عقیدت سے جگہ اٹھو میں نے کفر  
حاضر ہے خدمت کو کرماندہ سے ہوئے کفر ایمان مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر  
کعبہ مرے پیچھے ہے کیسا مرے آگے

میں وہ ہوں کہ جس کام کو چاہا نہ رکا کام اس شوخ کے آگے نہ چلا پر نہ چلا کام  
حیرت ہے کہ کیوں اپنی تمنائیں ہوں نا کام عاشق ہوں پر معشوق فوجی پر مرا کام  
مجنوں کو بُرا کہتی ہے یلی مرے آگے

فرقت میں گزرتے تھے جو سو طرح کے صدمے کرتا تھا دھار و کھپس جسم سے نکلے  
اب ان سے جو ملنا ہوا دی جان خوشی سے خوش ہوتے ہیں پر میل میں یوں نہیں جاتے  
آئی شب ہجران کی تم مرے آگے

موجود ہے جو سوزِ دروں کا شہ بھی ہو ہے جھڑپ اب جوشِ جنوں کا شہ بھی ہو

بقیہ صفحہ ۲۱۶ کا ۱۸۔ حسب مراتب مقام معزز و مکرم ہوئے۔ بارہ پر ایک بے تک حفوظ اقدس جلوہ فرمایا ہے۔

اب تک ہے جو کچھ مال زبوں کاش ہی ہو      ہے معجزن اک قلزم خوں کاش ہی ہو

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا مرے آگے

نظارہ نے نزع میں بھی دافع غم ہے      اٹھواتے ہو کیوں پاس کی کیا یہ کوئی کم ہے

ٹھہرو کہ یہ برتاؤ دم مرگ ستم ہے      گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

رہنے دوا ابھی ساغ و مینا مرے آگے

وابستہ ہے اس ذات سے جو نابہ میرا      اس امر میں مرزا ابھی ہم آواز ہے میرا

ہم کار ہے اور ہمد او دمساز ہے میرا      ہم پیشہ وہم مشرب و ہمارا ہے میرا

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۲۲۲

امید کیا ہے جو کچھ اپنا مابرا کیئے      ہماری بات کو کب آپ نے سنا کیئے

کروں جو شکوہ تو پھر کیا مری خطا کیئے      کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کیئے

تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کیئے

اگرچہ حسن کے جو رجو جفا ہی زلیور ہیں      حسین انھیں سے تو آراستہ سرا امر ہیں

خدا خواستہ کب یہ تمہارے جو ہر ہیں      نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستم گر ہیں

مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بے کیئے

جو آشنا ہو وہی آشنا کے گھر جائے      نہ بڑھ سکے کا قدم کوئی غیر اگر جائے



جسے جو جس سے تعلق وہ بے خطر جائے وہ میسر سہی پردل میں جب اتر جائے

نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیئے

ہزار سینے کو چھلنی بنائے زخمِ سناں کشاد دل میں مگر تیر کو بے دخل کہاں

کھلا ہوا ہو جرات تو ہے وہ رستا جاں نہیں ذریعہ راحت جرات پر کیاں

وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کیئے

بشر کو چاہیے ہو صاف سید کیئے سے بُرا ہے ظلم و ستم گو ہو ظلم کے بدلے

مزا تو یہ ہے کہ بن جاؤ دوست دشمن کے جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیئے

جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کیئے

کبھی جو بیٹھ بھی جاتے ہیں ہم غزل لکھنے تو بار بار تقاضے یہ ہوتے ہیں دل کے

کہ آج خوب ہی جی بھر کے رویئے دکھڑے کہیں حقیقت جاں کا ہتی مرض لکھئے

کہیں مصیبتِ ناسازی دوا کیئے

کبھی بیانِ ملاں دلِ حزیں کیئے کبھی فغانِ جہاں سوز و آتشیں کیئے

کبھی روایتِ ہجرتِ حسین کیئے کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیئے

کبھی حکایتِ مبرگرِ نیر پا کیئے

نجاتِ غم سے جوئے اس کو اور کیا دیئے نثار کیئے دل کو یہی صلا دیئے

جو سراٹائے تو جلا دے کو دعا دیئے رہے نہ جان تو قاتل کو نوں بہا دیئے

کئے زبان تو بخیر کو مرحبا کیئے

جو یار پاس نہیں ہے خیال یار تو ہے      تصور اس کا شبِ غم میں غلگسار تو ہے  
یہ اک ذریعہ تسکین جانِ زار تو ہے      نہیں نگار کو الفت نہ ہونگار تو ہے  
روانی روش و مستی ادا کیے

جو فرش گل نہیں حاصل تو سبزہ زار تو ہے      چمن نہیں تو مرا سینہ داغدار تو ہے  
جو گل نصیب میں اپنے نہیں ہزار تو ہے      نہیں بہار کو دھت نہ ہو بیار تو ہے  
طراوت چمن و خوبی ہوا کیے  
نہات غم سے نہ ہوگی یقین تھا غالب      مقامِ شکر ہے سر سے ٹلی بلا غالب  
یہی ہوسلک مرزا بھی میرزا غالب      سفید جب کہ کنارے پر لگا غالب  
خدا سے کیا تم و جوہرِ نا خدا کیے

۱۲۳

با آبرو تو خلق میں کیا خاک ہو گئے      تھے غرقِ بحرِ شرم کہ پیر اک ہو گئے  
مشہور اک زمانہ کے چالاک ہو گئے      رونے سے اور عشق میں بیدار ہو گئے  
دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

نئی کشتی کی چاٹ جو بیٹھ بگی ہوئی      پینے میں ہم نے آنکھ پہر کچھ کمی نہ کی  
آخر کو رنگ لاکے رہی اپنی مفلسی      صرف بہائے ہوئے آلاتِ کشتی  
تھے یہ ہی دو حساب سولیوں پاک ہو گئے

پلٹے نہیں ہو اب تو ذرا بھی کسی سے تم ہر اک سے پیش آنے لگے دل لگی سے تم  
 جا جا کے اب تو ملنے ہو ہر آدمی سے تم رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم  
 بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

جن کو نہیں ہے عاشقی و عشق کی خبر ہوتے ہیں معترض و ہی تاثیرِ آہ پر  
 گلشن میں دیکھیے اثرِ آہ الحذر کہتا ہے کون نالہ بلبیل کو بے اثر  
 پرے میں گلی کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

دل میں وہ آگ تھی کہ سراپا جلا دیا ہستی کو عاشقوں نے دیا خاک میں ملا  
 پایا انھوں نے زندگی شمع کا مزا پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا  
 آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرتے تھے جی ہی جی میں دمِ رنج و غم گلہ تھا عالمِ خیال ہی میں دمِ بدم گلہ  
 جرات جو پھر بڑھی تو ہوا ہم کو سم گلہ کرنے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ  
 کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

مہرِ اجول تھا اس کے لئے بے بود و باش کرتے ہی قتل اس کو کیا پہلے پاش پاش  
 ظالم نے خود ہی کر دیا پردہ ستم کا فاش اس رنگ سے اٹھائی کلی اسنے اسد کی لاش  
 دشمن ملی جس کو دیکھ کے غم ناک ہو گئے

۲۲۲

مجھ کو غم سے رہا کرے کوئی      غم گساری ذرا کرے کوئی  
 لاکھ دعویٰ کیا کرے کوئی      ابن مریم ہوا کرے کوئی  
 میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

حلقہ زلف حلقہ زنجیر      دونوں ابرو ہیں خنجر و شمشیر  
 جلوہ حسن وہ کہ برق نظیر      چال جیسی کڑی کمان کا تیر  
 دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

میرا قاتل وہی نگار سہی      دو جہاں میں قصور وار سہی  
 خوں بہا اس کے سر ہزار سہی      شرع و آئین پر مدار سہی  
 ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

اس کی محفل تمام گونجی ہے      کچھ کہے کس کو تاب اتنی ہے  
 لب ہلائے مجال کس کی ہے      بات پرواں زبان کتنی ہے  
 وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

ذکر ہوتا ہے جا بجا کیا کچھ      غور کرتے ہیں آشنا کیا کچھ  
 کہہ گیا دل کا مدعا کیا کچھ      بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ  
 کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

جو لڑے اس سے تم لڑو نہ کبھی رکھو آزاد زندگی اپنی  
کیا ضرورت جواب دینے کی نہ سناو گر بُرا کہے کوئی  
نہ کہو گر بُرا کرے کوئی

کوئی تم کو جو دے اذیت بھی درپے انتقام ہونہ کبھی  
رہنمائیِ خلق ہے اچھی روک لو گر غلط چلے کوئی  
بخش دو گر خطا کرے کوئی

جو بظاہر ہی خرم و خور سند وہ ہیں ناشاد تم سے بھی دہ چند  
ہے درِ احتیاج کس پر بند کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند  
کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیوں نہ شکوہ کریں مقدر سے کھینچ لایا ہے دشت میں گھر سے  
رکھئے امید خاک رہبر سے کیا کیا خضر نے سکندر سے  
اب کسے رہنما کرے کوئی

ان سے جب تک امید تھی غالب شکوہ سخی کی خور ہی غالب  
حق ہے مرزا کی خامشی غالب جب توقع ہی اٹھ گئی غالب  
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

---

اے خضر و سکندر راقم مشہور ہے خضر و سکندر بادشاہ کو آپ حیات کے چشمے پر لگئے۔ خود تو آپ حیات پتی لیا  
اور سکندر کو ان لوگوں کے سامنے لگئے جو آپ حیات پر ہر پھولِ اعریٰ ضعیف و ناتواں ہو کر ڈھلے بغیر  
لگے تھے سکندر نے عالم دیکھ کر آپ حیات پینے سے انکار کر دیا یہاں تک کہ اس شعر میں ہے۔ (باقی ص ۳۲۳)

فلک کے جوئے غم کیا ہے اور ہم کیا ہے یہ میری تاک میں اور در پہ ستم کیا ہے  
 جوئے کدہ ہے سلامت تو پھر الم کیا ہے بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے  
 غلام ساقی کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہارے قول ہیں کیا چیز اور قسم کیا ہے نال اس کا ستم ہے تو یہ کرم کیا ہے  
 ذلیل ہو گا کسی دن اسے بھرم کیا ہے تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے  
 رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

نجومیوں کے خیالات فام ہیں بے سود نہ سعد و حس نہ انکے شگون کا ہے وجود  
 کسی پر کھل نہیں سستی شذیت معبود لکھا کرے کوئی احکام طالع مولود  
 کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے

کرے حلف سے بھی وہ بت جو ترکِ روجھا مجھے یقین نہ آیا نہ آئے گا اصلا  
 خدا سے مخوف اور منکر جزا و سزا نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا  
 خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

ہوئی ہے مہرِ سلیمان کی عدل سے حکم دکھائی دیتا تھا عالم یہ جام پر تھا بھرم  
 انھیں صفات سے دونوں کا ہے وجود عدم وہ داد و دید گرا نما یہ شرط ہے ہمد

بقیہ صفحہ ۲۲۱ کا ۱۔ فرماتے ہیں حضرت سکندر نے کیا کیا؟ یعنی کچھ نہیں کیا۔ گویا آخر کی رہنمائی سے بھی سکندر کو کچھ حاصل نہیں ہوا کوئی اب کسے رہنا بتائے۔



ہمیں جب نے اٹھو یا عد سے یاد ہو وہ نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن

بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

ترے گیسوئے پیانے کے مقابل کتبِ قد تھا زمانہ نے مگر اک فتنہ محشر سے سمجھا

غنیمت ہے کہ اس بھیپیگی ذکر رکھ لیا ہوا بھر کھل جائے ظالم یہ قامت کی دازی کا

اگر اس طرہ پر بیچ و خم کا بیچ و خم نکلے

عجب کیا ہے ہمارا خطا اگر اسکو پسند آئے پھر ک جائے عبارت دیکھ کر اور قدر فرمائے

نہ پہونچیں ہم تو کیا تحریر ہی اپنی بیچ جائے مگر لکھوئے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوئے

ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی ہر رنگ میں جب پیر نہ خانہ کو ناکامی ندور جام سے حاصل ہوا کچھ غیر بدنامی

نظرِ صاف کی میکشون کے ظرف میں خامی ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بلاہ اشرا

پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جامِ جم نکلے

کریں کیا فلکاتِ حالِ مرد و غم سنانے کی کہاں نوبت کسی کو اپنے زخمِ دل دکھانے کی

کریں کیا شکوہ کچھ حالتِ ہی تجھے زمانے کی ہوئی جن سے توقعِ خستگی کی داد پانے کی

وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تیغِ الم نکلے

اگر ہم شمعِ سوزن ہیں تو وہ آتشِ کلہر کا لا جلا نا خافہ اس کا ہماری زندگی جلنا

اسی کا پر توہ ہے اپنا سامانِ بھاگ لایا محبت میں نہیں ہے فرقِ صیغہ اور مرنے کا

اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فرقہ دم نکلے



سرِ منبر کیا کرتا تو ہے مے کا بیاں واعظ      بیانِ حرمت دوسیں پر مشہور جہاں واعظ  
 یہی حیرت ہر مرزا کو بھی کیوں نہی اوہاں واعظ      کہاں مینارِ کا دروازہ غالب رکھاں واعظ  
 پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جانتا تھا کہ ہم نکلے

(۱۲۷)

ساقی سیاہ مست ہے تو لطفِ خاک ہے      قصہ ہی پھر تو پینے پلانے کا پاک ہے  
 ساقی کی آنکھ پر ربطِ صہبائی تاک ہے      مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے  
 موجِ شراب یک مژدہ خوابناک ہے  
 رہتی ہے اس کو خنجر و پیرکائی جستجو      آنکھوں پہرے ذوقِ جرات کی گفتگو  
 ہر دم سنان و تیر کا نقشہ ہے روبرو      جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو  
 جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے  
 وادیِ تنگ اب ہمیں بھاتا نہیں اسد      نظروں میں اپنی دشت سماتا نہیں اسد  
 مرزا بھی راہِ چارہ بتاتا نہیں اسد      جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد  
 صحرا ہمارے آنکھ میں اک مشیتِ خاک ہے

(۱۲۸)

اس کی ہوا میں ہر گلِ تر دلِ فگار ہے      رخ کا پسینہ روکشِ عطر ہمار ہے

بوئے بدن سے بادِ صبا مشکبا ہے جس ہانسیم شانہ کش زلفِ یار ہے  
نافہ دماغ آہوئے مشکبِ تار ہے

دل جیتے جی اٹھائے گیا سر پہ بارِ شوق ہم خاک میں ملے تو ہوا انتشارِ شوق  
کیونکر فضلے دشت نہ ہوا بے شکارِ شوق ہے ذرہ ذرہ تنگی جا سے غبارِ شوق  
گردام یہ ہے وسعتِ صحرائِ شکار ہے

آنکھوں سے کون پرندہ نشیں ہو چھپا ہوا کس کے خیالِ دید میں سکتے سا ہو گیا  
کیوں اس طرح کیا ہے تہیہ تلاش کا کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو یا خدا  
آئینہ فرشِ شش جہت انتظار ہے

ہے بس کہ شونخ چشم بڑا مدعا علیہ تسلیم کیوں کرے گا خطا مدعا علیہ  
دے گا جواب دیکھئے کیا مدعا علیہ دلِ مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ  
نظارہ کا مقدمہ پھر رو بکار ہے

تیارِ سفر میں ہے غنچوں کو پچ و تاب پادِ رکاب ہیں یہ گلوں کو ہے اضطراب  
پتے اتر کے شاخ سے کرتے ہیں پاتراب چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پر آب  
اے عندلیب وقتِ وداع بہار ہے

ہو کیوں نہ انتظار سے دل بستگی مجھے تسکین اس خیال ہی سے ہے بھری مجھے  
ایفا کی گونہیں ہے کچھ امید بھی مجھے بیچ آپڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے  
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اب تک تو جبر کی بھی نہ تجھ پر پڑی فلسفہ      فزوں کی آنکھیں دیکھ کہیں ہوں پردہ در  
یہی نہ پھرنا چاہیے بے باک اس قدر      بے پردہ سوئے ولادی جنوں گزر نہ کر

ہر ذرہ کے نقاب میں دل بے قرار ہے

بے کار ہے مرقع دل واہ کیا کہی      آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو ہوس مڑا کہی  
ہو پاس ایسا آئینہ اور پھر یہ مگر وہی      دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی

اے بیدار آئینہ تمثال دار ہے

اٹھنے کو ہے چمن سے عملداری خزاں      تنہا بھی پھر نہ آئے گا تجھ کو نظر یہاں  
غافل یہ کثرتِ خس و خاشاک پھر کہاں      اے عندلیب یک کونخس پہر آشیاں

طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

مرزا کی طرح کچھ بھی نہیں اس کو احتیاط      یہ غم کہہ اور اس میں یہ فرحت یہ انبساط  
یہ جوشِ حرص اور قویٰ میں یہ انحطاط      غفلتِ کفیلِ عمرو اسدِ فاضلِ نشاط

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

تو وہ حسین ہے کہ خود آرا کہیں جسے      شاہانِ حسنِ تاجِ سرا پہنا کہیں جسے  
ہے اور کون حسن میں یکتا کہیں جسے      آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے  
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

جیران ہے جو الفت حسن و جمال میں      اک انقلاب ہے دلِ خستہ کے حال میں  
 سکتے ہو انصویرِ ذوق وصال میں      حسرت نے لار کھاتری بزمِ خیال میں  
 گلہ ستم نگاہ سویدا کہیں جسے

دل کو کیا ہے عشق نے کس غم میں مبتلا      کرتے ہیں اسکو بیم و رجاراتِ دن فنا  
 آنکھوں کو کس نے شوقِ نظر کا لگادیا      پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں لٹھیرا  
 افسسین انتظارِ تمنا کہیں جسے

کیونکر جنون و جوشِ حشر کوٹائے      وحشی کو کس طرح دمِ ضربت سنبھالے  
 دل کا غبار اور تو کیونکر نکالے      سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالے  
 وہ ایک مشتبہ خاک کہ صحرَا کہیں جسے

آنکھوں میں ہے سما یا ہوا بحرِ بیکراں      اس زور کا ہے مد و تلاطم کہ الاماں  
 دنیا کا حال کیا ہو اگر خشک ہوں واں      ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں  
 شوقِ عنان گینختہ دریا کہیں جسے

پھیلی ہوئی ہو چاندنی یا تیز ابر ہو      دونوں ہیں بے طرح متقاضی کہے ہو  
 نہوتی نہیں بسرِ جوشِ غم شرابِ دو      درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو  
 صبح بہارِ پسندِ مینا کہیں جسے

جس کے برائی دل میں ہو اچھا وہ کیا ہو      کچھ بھی گلہ نہیں ہے اگر ناسزا کہے  
 مرزا سے صبرِ سیکھ کہ دنیا بھلا کہے      غالب برا نہ مان جو واعظِ بُرا کہے  
 لے مابشرِ مٹیر

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

(۱۳۰)

سامانِ مرگ پہلے جیا کرے کوئی      پھر تجھ سے گفتگو کی تمنا کیے کوئی  
بیٹھا خاموش یوں تجھے دیکھا کرے کوئی      جب تنگ و بانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی  
مشکل کرتجھ سے راہِ سخن واکرے کوئی

کیونکر ہو خاکِ عاشقِ جانبا ز سے مفر      اس کو ہوائے ہوس پہ پھرتی ہر دوش پر  
وادیِ نجد پر ہی نہیں صرف منحصر      عالمِ غبار و حشرِ مجنوں ہے سر بسر  
کب تک خیالِ طرہٴ لیلیٰ کرے کوئی

یہ مردہ دل میں تھی جو تمناۓ التفات      آخر وہ آج کرتے ہوئے آئے التفات  
لیکن یہ جان لیں جو ہے دعاۓ التفات      افسردگی نہیں طرب افزائے التفات  
ہاں دردِ دل کے دل میں مگر جا کرے کوئی

کتنے ہیں صبر و ضبط میں اٹھوں پہر مجھے      دل کھول کر بہانے دے ابا شکِ تر مجھے  
چھوڑاں نصیحتوں کو نہ گھونٹا سقد مجھے      رونے سے اے ندیمِ ملامت نہ کر مجھے

حاشیہ ص ۲۲۸ کا آغاز صاحبِ بیعت الحق سیاح کو ایک خط میں اس طرح لکھتے ہیں: محالی سیف الحق تمہارا خط پہنچا  
قاصی صاحبِ بردہ کو معاف کر کوئی وجہ اپنے پرانے عتاب کی پاتا تو ان سے عذر کرتا اور اپنا گناہ معاف  
کر دیتا جب سببِ ملاز کا ظہر نہیں تو میں کیا کروں تم برا نہ مانو کس واسطے کہ اگر میں برا ہوں تو اس نے سچ کہا اور  
اگر میں اچھا ہوں اور اس نے برا کہا تو اس کو خدا کے حوالے کر دے

غالبِ برادمان جو دشمن بُرا کہیں      ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

آخر کبھی تو عقدہ دل وا کرے کوئی

دل خستگی ہزار طرح رونما ہوئی      با ایں ہمہ انھیں نہ توجہ ذرا ہوئی  
میں نے قبا جو چاک نہ کی کیا خطا ہوئی      چاک جگر سے جب رہ پریش نہ وا ہوئی

کیا فائدہ کہ حیب کو رسوا کرے کوئی

وا دی کے سامنے ہے چین کا چراغ گل      باد بہار کا نفسِ سر دسے ہے غل  
کیونکر نہ رشکِ گلشنِ جنت ہو دشت گل      لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل

تا چند باغبانی صحرَا کرے کوئی

تیری شعاعِ حسن ہے اک تیر چشمِ دوز      مطلق نہیں ہے آنکھ کو تاپِ نظرِ ہنوز  
ہم دیکھیں کس طرح مجھے اے ہریم روز      ناکامی نگاہ ہے برقی نظارہ سوز

تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

دشتِ زردوں کو کیا خبرِ فرقِ دو پاؤں دشت      اطفالِ گردِ مریں وہ ہیں بنیِ دھن میں  
سر پہوٹنے کا مفت میں ہوتا ہے بندوبست      ہر رنگِ نشت ہے صدفِ گوہرِ شکست

نقصان نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

ہم چاہتے ضرور کچھ اپنے خدا سے عمر      بڑھ جاتی شاید اور دعا و دوا سے عمر  
تنگ آگئی مگر ترے عہدِ وفا سے عمر      سربر ہوئی نہ وعدہ صبرِ آرماسے عمر

فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

آوارگیِ دشت ہے دشتِ زرد کا شغل      حسرت کشی ہے ضعف کے مارے ہوئے کا شغل

دامان و جیب پھاڑنا بھی ہمنے کا شغل      بیکاری جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل  
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

بے کار ہے سخن سے طبیعت کا خیر و میز      انشاؤں خیر سے بے جا نہیں گریز  
بے سود ہے نتیجہ افکار طبع تیز      ہے وحشت طبیعت ایجاد یاس خیز  
یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

روشن کلام دہرے کا فور ہے آس      گویا چراغ مردہ و بے نور ہے آس  
مرزا بھی اب یہ کہنے پر مجبور ہے آس      حسن فروغ شمع سخن دور ہے آس  
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۳۱

یہ داغ دکھا کر جو گلستاں میں ہنسا ہے      عشاقِ دل افکار کے نزدیک خطا ہے  
ناوم ہے کہ غرقِ عقی شرم ہوا ہے      شبنم بہ گل لار نہ خالی زاد ا ہے

داغِ دل پر دردِ نظر گاہِ حیا ہے      مطلق نہیں حالِ دلِ غمگین سے خبر داز  
ہے بولے حنا سے یہ انھیں مستی بسیار      دلِ خوشدہ کش مکشِ حسرت دیدار  
فرست ہی نہیں ہاتھوں کے نظار سے زہا

آئینہ بدستِ بت بدستِ حنا ہے      کم آتش سوزاں سے نہیں حسرتِ دل بھی  
جلنا یہی اپنا ہے تو مٹ جائے گی ہستی

سینے میں تمنائے عجب آگ لگا دی      شعلے سے نہ ہوتی ہو سی شعلے جو کی  
 جی کس قدر افسردگی دل پر چلا ہے

تصویر کی کیا قدر کریں بغیر ہیں بندوق      ہم محو ہیں اس درجہ کہ رکھتا نہیں حد فوق  
 جاسکتا نہیں آئینہ سے تاباں بد ذوق      تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بھد ذوق  
 آئینہ باندا زنگل آغوش کشا ہے

قری کی صداؤں سے ہے ہر ہر مہر دنگ      بلبیل کے اس انداز سے ہر غچ ہے دل تنگ  
 دونوں میں ذرا سوزش پہاں کانہیں ہنگ      قمری کیف خاکسترو بلبیل نفس رنگ  
 اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے

عادت نے تری پست کیا ہمت دل کو      مجبور بدنامی پڑا حالت دل کو  
 بڑھنے نہ دیا ولولہ و جرات دل کو      خونے تری افسردہ کیا وحشت دل کو  
 معشوقی وبے حوصلگی طرفہ بلا ہے

وہ لاکھ جفائیں کرے دے لاکھ اذیت      دشوار ہے آسان نہیں ترکِ محبت  
 کچھ پاس زباں ہے یہیں کچھ پاس مروت      مجبوری و دعوائے گرفتاری الفت  
 دستِ تہہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

ہے قابلِ عشاق پریشان گزشتہ      باقی ہے ابھی اس میں وہی شانِ گزشتہ  
 کرتی ہے عیاں قتل کے سامانِ گزشتہ      معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ  
 تیغِ ستم آئینہ تصویرِ نمسا ہے



نظروں میں شبِ تار سے بدتر ہے سحر بھی      شائقِ ترے انوار کا دل بھی ہے جگر بھی  
روشن ہیں ترے نور سے دیوار بھی در بھی      اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی  
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

تقدیر ہی قدرت نے ہمیں ہی کچھ ایسی      ہم پر نہ پڑی ہے نہ پڑے تیری تجلی  
مردمِ بحرِ میہ نہیں جلوے سے کوئی      اے پر تو خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی  
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جاتا تو ہوں دنیا سے مگر بادلِ ناشاد      کیا کیجئے بے وقت پڑی موت کی افساد  
ایمان بھرے دل کی بھی ہر تجھ سے ہی فریاد      ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی تلۂ ۱۲  
یارِ بآگرانِ کردہ گناہوں کی سزا ہے

تو اہلِ زمانہ پہ جو مایل نہ ہو غالب      یہ حسرت و حیراں کبھی حاصل نہ ہو غالب  
مرزا کے سوا غیر کا قائل نہ ہو غالب      بے گانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالب  
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غلمان کی یہ شکل نہ صورت ہے حور کی      مجھے گا اسکو کیا کوئی ہے باتِ دور کی  
اک بہرِ امتحانِ حقّی ضیا کو وہ طور کی      منظورِ حقّی یہ شکلِ تجلی کو نور کی  
قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

بہرِ نظارہ اہلِ جہاں کے جماؤ ہیں      اندازِ ہر ادابے کرشمے ہیں چاؤ ہیں  
پھولوں کی بھیاں ہیں بدن چو گھاؤ ہیں      اک خوشکال کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں  
بڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر حور کی

وہ ہے کہاں کی جس سوزِ لذت اٹھا سکو      دیکھو نہ جس کو خود نہ کسی کو دکھا سکو  
خود جا سکو جناں میں نہ گھر بیٹھے پاسکو      واعظ نہ تم پیونہ کسی کو پلا سکو  
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی

پھر ہو رہا ہے مجھ کو قیامت کا سامنا      ہے دغذغہ وہی جو کبھی زندگی میں تھا  
یہ جان کر کہ آج ہے دنِ عدل و داد کا      لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں ٹھا  
گویا ابھی سنی نہیں آوازِ صورت کی

پھرتی ہے بے باغ نہ غم ہے نہ کوئی رنج      گانے لگی ترائے نوبے رباب و صنج  
گویا ہے گا اس کو زیرِ گل سے کوئی گنج      آمدِ بہار کی ہے جو بیل ہے نغمہ سنج  
اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طہور کی

مانا کہ یہ نگاہ سے ڈالے ہوئے تو ہیں      عزت کو لیکن اپنی سنبھالے ہوئے تو ہیں  
آمِ القربا کی گود کے پالے ہوئے تو ہیں      گواں نہیں پر واں کے نکالے ہوئے تو ہیں  
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

موسمی ہی تھے ملا ہے جنھیں یوں کھلا جوتا      دیکھیں تو دیتے ہیں بھی پرے سے کیا جواب  
خطرہ نہیں کسی کو اگر مل گیا جواب      کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی  
 مثلِ زبانِ شمعِ زباں میں ہے وہ اثر  
 پھونکا اسے کسی سے ہوئے ہم نمن اگر  
 پر کارِ آگ کا تمہیں کہتا ہے ہر بشر  
 گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر  
 کی جس سے بات اس نے شکایتِ ضرور کی  
 مرزا یہ شوقِ جج کا ہے جس طرح اب ہمیں  
 اس وقت تمہیں بوہی دلِ غالبِ حسیں  
 آخر یہ بات کہہ گیا وہ اُکے جوش میں  
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں  
 جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

(۱۳۳)

اس کو جو غمِ گردشِ ایام بہت ہے  
 اس واسطے جو یائے و جام بہت ہے  
 غمِ کھانے میں بودا دلِ نا کام بہت ہے  
 غمِ خوار و زندی میں یہ بدنام بہت ہے  
 یہ رنج کہ کم ہے مئےِ گلخام بہت ہے  
 مجھ زبلا نوش کو چپکا ہے یہے کا  
 ہو بادہ سر جوش ہی اس کی نہیں پروا  
 میں شوق سے لے لوں گا تو تلچھٹ بھی دے گا  
 کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورثا  
 ہے یوں کہ مجھے دُرِ دہرہ جام بہت ہے

لے یہ غزل اس زمانہ میں لکھی گئی تھی جبکہ ظفر نے کیلئے جانے کا ارادہ کیا تھا جس کی رپورٹ رزیڈنٹ دہلی نے بھیجی تھی  
 مرزا غالب نے براہِ جانے کی خواہش اس مقطع میں ظاہر کی ہے  
 غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے اٹھیں ۛ جج کا ثواب نذر کروں کا حضور کی

پنہاں نہیں اب دام گلستاں کی زمیں میں      خطہ ہی نہیں کوئی دل گوشہ گزیں میں  
چھتے نہیں اب غارِ عالمِ قلبِ خزیں میں      نے تیر کہاں میں ہے نہ میا کس میں  
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

لاپنج سے جو تکلیفِ عبادت کی اٹھائی      اس عابدِ ناداں نے عبث عمر گنوائی  
کیا فائدہ اعمال میں جب ہو نہ صفائی      کیا زہد کو مانوں وہ نہ ہو گوہرِ بیائی  
پاداشِ عمل کی طبعِ خام بہت ہے

آزادہ روی شیوہ بتاتے ہیں جو انساں      معلوم نہیں سمجھے ہیں کیا جی میں وہ ناداں  
آزاد تو ہو ہی نہیں سکتے کسی عنوان      ہیں اہلِ فرد کس روشِ خاصِ پنازاں  
پابستگی رسمِ ورہ عام بہت ہے

پینے میں لگے بادہ گلفام کے دھتے      ان سے ضلّ آجائے نہ ارکان میں حج کے  
فرصت میں ذرا بیٹھ کے دھولوں نصیب ہوتے      زہم ہی پر چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے

آلودہ برے جائے احرام بہت ہے      ترددِ بندگی اس کی کبھی میں نے کہا جو  
تیر دیدہ کی اس کی کبھی میں نے کہا جو      مجھ پر وہ عنایت کی نظر رکھتے ہیں اب تو  
خیرت ہے یہ بڑتاؤ ہو اور وصل نہ پھر ہو      ہے قہر گرا بھی نہ بنے بات کہ ان کو

انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے      میں یہ نہیں کہتا مجھے مرنا نہیں لے مرگ  
پنج جاؤں تو کچھ حرج بھی تیرا نہیں لے مرگ      خوں ہو کے فکرِ آنکھ سے نہ پکا نہیں لے مرگ  
حاشا کہ مجھے جان کی پروا نہیں لے مرگ

رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے  
 کیا دل کش و دلچسپ ہیں مہرا کے ترانے      بخشی ہے عجب طبع رسا اس کو خدا نے  
 مانا ہے اسے راہِ نما سب شعرا نے      ہو گا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نہ جانے  
 شاعر تو وہ اچھا ہے پر بدنام بہت ہے

۱۳۴

کیا کہیے کہ دل ہے پریشاں کئے ہوئے      آئینہ دار ہے مجھے حیراں کئے ہوئے  
 ہے انتظار آمدِ جاناں کئے ہوئے      مدت ہوئی ہے یا کر کو جہاں کئے ہوئے  
 جوشِ قدر سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے  
 دل کو تو چشمِ تر نے دیا اشکِ خوں میں کھو      کیا خاک مجھ سے کوئی نیا انتظام ہو  
 کہ دو رنگا پسین کش وہی حاضر ہو گھر میں جو      کرتا ہوں جمع پھر جگرِ سختِ لخت کو  
 عرصہ ہوا ہے دعوتِ مہرگاں کئے ہوئے  
 مدت کے بعد جوشِ جنوں نے کیا کرم      تابِ سکون و صبر گئی دل سے یک قلم  
 وحشت کی روک تھام نہ کی سکیں گے ہم      پھر وضعِ احتیاط سے رکے لگا ہے دم  
 برسوں ہوئے ہیں چاکِ گریباں کئے ہوئے  
 سینے میں پھر وہ آگ بھڑکنے لگی کہ بس      پھر جل کے خاک ہو گا تین زارِ مثلِ خس  
 پھر ضبطِ آہ پر نہ رہا دل کو دسترس      پھر گرم نا لہائے شر رہا رہے نفس

مردت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

کیا پوچھتے ہو کیا ہے غصہ بگاڑ عشق سرے سے ملے گا نہ اب تک ملا ہے عشق  
دل کیا کر اب تو دیئے جاں بر ملا ہر عشق پھر پریش جراتِ دل کو چلا ہر عشق

سامانِ صدر ہزار نمکدراں کئے ہوئے

پھر دل میں شوقِ دید سے ہر دردِ جا بگسل پھر اشکِ خوں بہاؤں گا آنکھوں سے متصل  
دکھلاؤں گا وہ رنگ کہ مانی ہو منفعل پھر بھر رہا ہوں غامہِ مژگاں بخونِ دل

سازِ چمن طرازیِ داماں کئے ہوئے

پیش آ رہا ہے عشق میں اک اقدارِ عجیب بیٹھے بٹھائے بھنس گئے آفت میں و غریب  
کیا دوسرے کو دونوں میں چھڑ جائے غمِ قریب باہم و گر ہوئے ہیں لُ دیدہ پھر قریب

نظارہ و خیال کا سامان کئے ہوئے

وحشت میں ٹھہر رہی ہے حورِ سوائیونکی لے ذلت کے مرچے کو کیا چاہتا ہے طے  
کھل کھیلنے کے اب تو تقاضے ہیں بچے پے پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے

پنڈار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پنڈر ہے مریضِ عشق کو تیمار کی طلب پھر اس دل غمیں کو بے غمِ خوار کی طلب  
الفن کو بھرے گرنی بازار کی طلب پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب

عقلمندی و عقل و دل و جاں کئے ہوئے

ہے رنگِ بونے قل کا جو پیشِ نظر خیال گلشن میں جا کے مست ہو پھر بس خبر خیال

دل گشت میں جا ہوا ہے پھر ادھر خیال      دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال  
صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے

سزا مر اس کے خط کا ہے اس درجہ دل ربا      جس کے ہر ایک حرف پہ ہیں جانِ دل فدا  
مضمونِ شوق دیکھئے لاتا ہے رنگ کیا      پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا  
جان نذرِ دل فریبی عنوان کئے ہوئے

نسکین سیر باغ سے کیا ہوگی ہم نفس      بے یار ہیں نظر میں گل تر بھی خارِ خس  
بے چین ہو رہا ہوں کہ دل پر نہیں بس      ملنگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس  
زلف سیاہ رخ پر پریشاں کئے ہوئے

بے وجہ تو نہیں ہوں میں آوارہ کو بکو      پھر تا ہوں تیغِ زن کے تجس میں چار سو  
بنغ نگاہ کی ہے ان آنکھوں کو جستجو      چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو  
سرمہ سے تیز دشنہ مڑگاں کئے ہوئے

مردوب چشم شوق نہیں روئے ہر و ماہ      اس گل کی بزمِ عیش کی دل دھونڈھتا رہا  
کب سامنے ہو دیکھئے ساقی کی جلوہ گاہ      اک نو بہار ناز کو تاکا ہے پھر نگاہ  
چہرہ فروغ سے گلستاں کئے ہوئے

تا چند انتظار کا دکھ جھیلے رہیں      کب تک رہیں چارہ احباب کے رہیں  
تا چند یوں جہادِ دلدار سے رہیں      پھر جی میں ہے کہ در پر کسی کے پڑے رہیں  
سر زمر بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

طاقت نہ وہ خیال میں باقی ذاب ہو سن وہ دن گئے کہ چین نہ بڑھتا تھا یا رہن!  
 رہتے تھے اس کی یادیں دل و دل تھا مطمئن جی دھونڈھتا پھر وہی فرصت کے رات دن  
 بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کے ہوئے  
 کیا سہل بات تھی کہ یہ سیلاب رک سکے روکارِ جوش جس نے وہ مرزا ہمیں تو تھے  
 اب بھی ہیں اپنی آنکھوں میں کیا بھوب ہوئے غالب ہمیں نہ چھپر کہ پھر جوشِ اشک سے  
 بیٹھے ہیں، ہم تہیہ طوفاں کے ہوئے

۱۳۵

جفاے یار تسلی ہے اک جہاں کے لئے خیرِ خوشی کی ہے آزادی و اماں کے لئے  
 ہوئی ہے وجہ تسلی دلِ تہاں کے لئے نویدِ امن ہے بیدارِ دوستِ جاں کے لئے  
 رہے نہ طرزِ رسم کوئی آسماں کے لئے  
 غذائے غم نو دلِ بے قرار و غمخوار ہے جگر کی تاک میں وہ دیدہ پر افسوس ہے  
 پڑی وہ لوٹ کہ حالتِ مری دگر گو ہے بلا سے گھرِ مرثیہ یا رشتہ خوں ہے  
 رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کے لئے  
 خطا معاف رہے اتنا س خلق لے خضر تمہیں نہیں ہو ذرا بھی تو پاس خلق لے خضر  
 چھپے ہو تم یہ تمہیں ہے ہر اس خلق لے خضر وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں شمسِ خلق لے خضر  
 دم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے



یہاں تک مے ملیں ہوئی ہے کثرتِ رشک      کبات بات سے ظاہر ہے اب علامتِ رشک  
کسی کو غیر کی راحت پہ ہوگی عادتِ رشک      رہا بلا میں بھی میں مبتلائے الفتِ رشک  
بلائے جاں ہے اوتیری اک جہاں کے لئے

وہ کشتی کہ جو قاتل سے رات دن ہو قریں      انھیں کو اس سے جدا کر کہو مجھے تسکیں  
کبھی تو دور سے ہو آرایشِ انکی کہیں      فلکِ دور کہ اس سے مجھے کہیں ہی نہیں  
دراز وستی و قاتل کے امتحان کے لئے

پڑا ہوا تو ہوں زنداں میں بستہ زنجیر      قہر نہ یہ تھا کہ کرتا نجبات کی تدبیر  
مگر مجھے تو یہ دھن ہے کہ گھر کروں تعمیر      مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ میرا اسیر  
کرے قفس میں فراہمِ خس اشیاں کے لئے

پڑا ہوا تھا میں دھونی آلا ستاں پر رماے      اہی آرزو میں کہ دربان کو ترس آجائے  
اسے بھی کوئی خصوصیت رہی کہ مجھ کو اٹھائے      گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت لئے  
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پامباں کے لئے

اے اس شعر کے متعلق مولانا علی گھٹے ہیں اور غزل ہیں ایسے بیخ اشعار شاید دو ہی چار اور نکلیں گے بولا نا آرزو ہو  
غائب کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے اندر زبان پر روانہ تھے۔ آغازِ مقدمہ میں بھی اس شعر پر کچھ باریک کیا ہوگا۔  
اس کی ایک اور خوبی کہ طرفِ اشارہ کیا جا تا ہے جو وہ غائب نے اس شعر میں بیان کیا ہے اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی  
ضروری تھی۔ ایک یہ کہ پامباں نے قاتل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ قاتل پامباں سے چاہتا کیا تھا سو یہ دونوں  
باتیں بصورتِ بیان نہیں کی گئیں صرف کنیزیں ادا کی گئی ہیں مگر راحت سے زیادہ وضوح کے ساتھ فورا بھیجیں جاتی  
ہیں یہی بات پر لفظ شامت اور دوسرے پر قہر یہ الفاظ دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا اور نیزہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور  
ایک وسیع خیال کہ وہ دھون میں رہی ہوئی ہے اور کرنا ترس بھی اس طرح اور کرنا شکل ہے یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔

سُنی میں چاہیے کوئی جدید طرزِ عمل      کہ طبعِ تیز کا کچھ حوصلہ تو جائے نکل  
 نہ کیوں ہر وعدہ تغزل میں رہ کئی بے کل      بقدر شوق نہیں ظرفِ تنگ سائے غزل  
 کچھ اور چاہیے وسعت مریاں کے لئے

ملا ہے جو طرب و عیش اس کو قسمت سے      بھلا وہ اس کے سوا ہے نصیب اور کس  
 مٹا دیا حسد و رشک کو بھی قدرت نے      دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے  
 بنا ہے عیش و نغمہ حسیں خاں کے لئے

یہ ذکرِ خیر مریب پر آگیا کس کا      بھرا سرور سے دل اور جگر ہوا ٹھنڈا  
 مجھے بیان پر اپنے ہے وجہ کیوں اتنا      زباں پر بارِ خدا یا یہ کس کا نام آیا  
 کہ میرے نطق نے بوسہ مریاں کے لئے

اسی کی شان کے شایاں پر شانِ شوکتِ ملک      اسی کے واسطے مخروں پر جواہرِ حُشمتِ ملک  
 ہے ہمیشہ یوں ہی برقرار ثروت و ملک      نصیرِ ولت و دیں اور معینِ ملت و ملک  
 بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستان کے لئے

ہر اک بشر کے لئے عیش کی ہے افزائش      خدا کے فضل سے آیا ہے دورِ آسائش  
 جسے طریق سے ہر شے کی ہو گی زیبائش      زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آسائش  
 نہیں گئے اور ستارے اب آسمان کے لئے

وہی تو مدح کی تمہید و ابتدا ہی ہے      نہ مدح نکلی گئی ہے نہ میں نے نکھی ہے  
 یہی کہاں مری طبع رسا نے بس کی ہے      ورقِ تمام ہوا اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہیے اس بحریہ کراں کے لئے  
 عجیب ڈھنگ نکالا ہے مدح گوئی کا  
 غزل سی نہیں دکھایا ہے اس نے رنگ نیا  
 طبیعت اس کی ہے حدت پسند لے مرزا  
 ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا  
 صلائے عام پر یارانِ نکتہ واں کے لئے

کم ہے غیروں سے اگر ہو وفا اور سہی  
 کوئی برتاؤ مروت کا نیا اور سہی  
 میری ایذا سے جو دل خوش نہ ہوا اور سہی  
 میں ہوں مشتاقِ بجا چھوڑ جاؤ اور سہی  
 تم ہو بیدار سے خوش اس سے سوا اور سہی  
 راتِ دلِ گریبے اور آٹھ پہرِ نالہ و آہ  
 سوگِ تم نے تو کچھ اس درجہ منایا کہ بہا  
 مرہی جلتے دو اگر مرہی گیا ہے گمراہ  
 غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غرت ماہ  
 ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ ہوا اور سہی

کبر و نخوت کی زلزلے میں دہائی کیوں ہے  
 دل میں ناحق ہوسِ خام پکائی کیوں ہے  
 خود نما کیوں ہو خودی میں مسمائی کیوں ہے  
 تم ہو بت پھر تمہیں ہندارِ ضلّی کیوں ہے  
 تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی  
 یہ تو مانا کہ حسینوں کی نہیں کوئی کمی  
 آن بان ایسی کسی میں کمی دیکھی نہ سنی  
 حسن میں آپ سے بڑھ کر نہیں ہونی کمی  
 منہ حسینانِ ارم آکے ملائیں تو سہی

حور کا شیوہ انداز و ادا اور سہی

کیا قیام اور قعود اور ہے سجدہ کیسا      سر مرا جھک نہیں سکتا ہے تیرے در کے سوا

تھا جو بے چین تو ہر پھر کے ادھر ہی پہنچا      تیرے کوپے کا ہے مائل دل مضطرب

کعبہ اک اور سہی قبلہ نما اور سہی

کیا انوکھا جن غلدریں ہے واعظ      باغ دیکھے ہی نہیں تو نے یقیں ہے واعظ

تیری باتوں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہے واعظ      کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ

غلدر بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

یاں تو دل کھول کے ارمان نکالیں رب      تنگی دہر کی کچھ داد تو پالیں یارب

سیر کا لطف تو جی بھر کے اٹھالیں یارب      کیوں نہ فردوس میں دو رخ بھی ملا لیں رب

سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

کر دیا ہے غم بھراں نے مرا حال زبول      بڑھتے بڑھتے خنقاں پہنچی ہے نوبت بربزوں

دیر مرنے میں لگے لگی جو کھلائی افیوں      مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں

زہر کچھ اور سہی آپ بخت اور سہی

طبع دیوان سے جو غالب نے فراغت پائی      یار و احباب نے مرزا نئی آفت ڈھائی

کی غزل نظم تو یوں لب پر نکایت آئی      مجھ سے غالب یہ علانی نے غزل لکھوائی

ایک سیراد گیر رخ فزا اور سہی

سے غزل نمبر ۱۳۶۔ دیوان مطبوعہ میں نہیں ہے اردوئے معلیٰ حاصل رقم موسومہ نواب امین الدین احمد خان صاحب

شکوہ درد بھی اک گونہ خطاب ہے تو سہی      نالہ و آہ سے اظہارِ جفا ہے تو سہی  
 صبرِ پیاف بھی منافیِ رضا ہے تو سہی      آپ نے مستحقِ الضو کہا ہے تو سہی  
 یہ بھی یا حضرت ایوب گلا ہے تو سہی  
 ہم نشینوں کو ہے کیا میری مصیبت کی خبر      کرتے ہیں صبر کی نقلین مجھے آٹھ پہر  
 دل ہی تو ہے مے سینے میں نہ کوئی بہتھر      رنج طاقت سے سوا ہو تو نہ بیٹوں کیونکر  
 ذہن میں خوبی تسلیم و رضا ہے تو سہی  
 اُس باقی ہے تو برسوں ہیں بہلائے گی عمر      سبز باغِ آٹھ پہر فکر میں دکھلائے گی عمر  
 داد ملنے کے لئے گویا نہی تڑپائے گی عمر      ہے غنیمت کہ بے امید گزر جائے گی عمر  
 نہ ملے داد مگر روزِ جزا ہے تو سہی  
 کس کا چارہ فقط الزام سے ہوتے ہیں بری      کون اٹھاتا ہے مریضوں کے لئے دردِ دہری  
 منہ نہ کھلواؤ کہ احباب کی ہے پردہ درمی      دوست ہی کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گرمی  
 نہ سہی ایک تمنا ہے دوا ہے تو سہی  
 ہم سے بڑنا ہے جو کچھ اسی قابلِ ہم تھے      کہتے بد عہد و جفا کار اسے کس منہ سے  
 بے فروت ہے وہ کیونکر کوئی انصاف کرے      غیر سے دیکھئے کیا خوب نباہی اس نے  
 نہ سہی ہم سے ہر اس بت میں وفا ہے تو سہی

گو کہ واقف نہیں تقدیر کے احوال سے میں      خط قسمت نہیں پڑھ سکتا کسی حال سے میں  
یوں نگاتا ہوں پتہ اپنے ہی افعال سے میں      نقل کرتا ہوں اسے نامہ اعمال سے میں  
کچھ نہ کچھ روز ازل تم نے لکھا ہے تو سہی  
جس طرح صبر سے مزارے گزاری غالب      زندگی کا تو اسی طرح سے تم بھی غالب  
جان دیتے ہی کسی روز بنے گی غالب      کبھی چل جائے گی کیوں کہ تے ہو جلدی غالب  
شہرہ تیزی شمشیر قضا ہے تو سہی

## قطعات پنج تکمیل اراق ہذا

کی شرحِ نظم غالب تضمین میں جو مرزا      ظاہر ہوئے معانی حل ہو گئے مطالب  
جی میں خیال آیا تاریخ اس کی لکھے      بولا سروش غیبی روح کلام غالب

نوٹ: ۱۔ یہ غزل ۱۳۷۱ء ذی القعدہ ۱۲۹۱ھ میں صاحبِ طالع رئیسِ دہلی کا عطیہ ہے فرمانے تھے کہ میں ہر وقت  
پچھو جان (غالب) کی خدمت میں حاضر باش تھا نیا کلام اپنی یادداشت میں لکھتا تھا اور مجلس یہ غزل ہے۔

تمام شد

ضمیمہ

## تفہیم بر غزل فارسی مولانا جامیؒ

کیا شوق زیارت نے پریشان یارِ رسول اللہ      ہوا رسول در جد سے سخت حیراں یارِ رسول اللہ  
خدا کی واسطے کچھ کیجئے دعاں یارِ رسول اللہ      تنم فرسودہ جاں بآرا و بجاں یارِ رسول اللہ

و لم پردرد آوارہ ز عصیاں یارِ رسول اللہ  
نہ دلیں صبر کی طاقت نہ جانیں ہر شکیبائی      نہیں اب بارِ فوق کے اٹھانیکی توانائی  
دکھاؤ شکلِ نورانی بناؤ مجھ کو سودائی      شب و روز از شکیبائی ز حد گشتم تمنائی  
خلوت سوئے من آئی خراماں یارِ رسول اللہ

ہوئے قدرت سے چاروں یارِ رسول آپ کے ہمد      محبت کے تھے چاروں حرف گویا متصل باہم  
خدا نے انکو اسرارِ نبوت کا کہا مخرم      بصدقت خریدارم عمرادوست میدارم  
بعثمان و علی آرم فدا جاں یارِ رسول اللہ

نہیں اسوقت بد میں کوئی میرا نموش ہدم      سہا ہے تمہاری ذات کا یا سرورِ عالم  
ندامت ہو دردِ اعتدالِ ناکارہ میں بہیم      ز کردہ خوش حیرانم سیر شد زورِ عصیانم  
پیشمانم پیشمانم پیشماں یارِ رسول اللہ

غمِ فراق میں برسوں کی بے گنت گہری  
متاعِ مال و زر تھی جس قدر باد کی ساری  
نہیں کچھ پاسِ قرب کی گزیر کی سخت لچاری  
چہ سوئے من گزرائی میں مسکینِ زنداداری  
نثارِ نقشِ نعینتِ کم جاں یارِ رسول اللہ

چلا سوئے عدم مرزا نہایت بے سرو سامان  
نہیں ہر ساتھ تو شہِ آخرت کا کچھ مخر عیال  
ہے اتنی عرض یا مولامری جاں تمہی ہو قرباں  
چوں بازوئے شفاعت را کشائی برگزیناں  
مکن محروم جامی را دران آں یارِ رسول اللہ

## تضمینِ برغزل مولانا منشی حسین صاحب سونے ال

دکھاؤ بتورئے عالم آرا یا رسول اللہ  
بنالواپنا دیوانہ خدا را یا رسول اللہ  
عنایت کی نظر ہوں تمہارا یا رسول اللہ  
ہمیں ہے ذاتِ اقدس کا سہا یا رسول اللہ  
تمہارے بن نہیں کوئی ہمارا یا رسول اللہ

گہیں جلدی نقاب پر نہ پر نور سے الٹو  
کسی خواب میں اگر ہی مجھ کو شرف بخشو  
نہایت مضطرب شوقِ زیارت نے کیا مجھ کو  
کہوں میں تم سے کیا تم مرم راز الہی ہو  
تمہیں معلوم ہی احوال سارا یا رسول اللہ



قدیرِ سایہ نکر دی ہے توحیدِ خدا ثابت تمہاری شانِ بڑھتی ہو شانِ کبریا ثابت  
اشاروں میں ہی دعوتِ نبوت کو کیا ثابت مجھے شوقِ اتم کے مجھ سے ہو گیا ثابت

بلندی پر تمہارا ہے ستارا یا رسول اللہ

تمہارا ذکر جاری ہر بنا پر میری صبح و شام یہ ہے وہ درجہ جس سے درجے میں غم و الام  
تمہارے نام ہے دلوں کو راحت جاں کو آرام لیا کیجئے نہ کیونکر بیٹھتے اٹھتے تمہارا نام

تمہارا نام لگتا ہے پیارا یا رسول اللہ

بھروسہ ہے تمہارا خواجہ ہر دوسرا ہم کو قیامت میں گناہوں کا نہیں کٹکا ذرا ہم کو  
شفاعت کر کے بیشک آپ لینگے بخشوا ہم کو اگر یہ کیسے ہی عاصی ہیں بخشے گا خطا ہم کو

ذرا بھی کیجئے گا گراشا یا رسول اللہ

زیارت نہ نہ روضہ کی مشرف ہو گا یہ جب تک نہیں ممکن بنے علنا اس خیف و زار کا تنگ  
گزاری جس طرح گرمی پریشانی میں اتنگ دینے میں مجھے پاس اپنے اب بلوائے گتنگ

پھروں گا بند میں میں مارا مارا یا رسول اللہ

بھلائی پر نہ بھلو نفس نے ہونے دیا قادر بدی میں ہو گیا یکتا کوئی میں رہا قاصر  
طلبِ گارِ حمایت اب ہوا سرکار میں حاضر کرو اسوقت بد میں دستگیری تم کریں آخر

جرا ہوں یا بھلا ہوں ہوں تمہارا یا رسول اللہ

ہے گستاخی سراسر شکوہ سوزِ ہواں کرنا      اوب کے برخلاف آہ و بکا شور و فغاں کرنا  
 فضول ایک ہے اظہارِ بے تابی جانی کرنا      عیب ہے تم کو اب ہر وقت درِ دل بیاں کرنا  
 غم پہناں ہے تم پر آشکارا یا رسول اللہ

ہمیشہ ذاتِ اقدس کا رہا سر پر مے سایہ      قہیلی کی کبھی گریں ہجوم غم سے گھبرایا  
 جہاں نیم جاں پہنچا تمہیں موجود ہواں پایا      تصدق آپ کے الطاف کے لبیک فرمایا  
 کبھی گر روزِ غم میں نے پکارا یا رسول اللہ

زیارت کی محال اور جذبِ الٰہی کوئی راہ      کسی دن اے ہوائے شوق اڑا لے چل بھڑا گاہ  
 میں اوریوں نثرِ عالم کے دے سے ہوئے آہ      مجھے اور حکم بود و باش ملک ہند یا اللہ  
 میں اوریوں زیرِ فرمان نصارا یا رسول اللہ

نہیں ہے آپ کے مزار میں باقی طاقت جہاں      قرون پر دمدم اس پر نجومِ حسرت و ارجاں  
 مدین میں بلا لویا نبی اتنا کرو احساں      دیارِ ہند ہے کیونکر گئے اسمیں دل سوزاں  
 مدینہ ہے نہ مکہ نہ بحار یا رسول اللہ

## تضمین بر سلام میر وحید صاحب مرقوم لکھنوی

نام ہو جس کا علی نام خدا ایسا تو ہو      ہو جسے معراج دوش مصطفیٰ ایسا تو ہو  
نام ہو جس کی نصیری ہیں خدا ایسا تو ہو      خلق کے بیٹے کا حامی نا خدا ایسا تو ہو

جس پہ دھوکا ہو خدا کا نا خدا ایسا تو ہو

عاشق نام خدا اہل سنا ایسا تو ہو      ہو گئے جس کے لپس حق پر خدا ایسا تو ہو  
جو کرے یوں بندگی حق کی ادا ایسا تو ہو      گھر ٹٹایا شاہ نے وعدہ وفا ایسا تو ہو

دے دیا سجدہ میں سر عشق خدا ایسا تو ہو

جسم بھی ہو ہرے تھاق نے بنایا آپ کا      سایہ کی جا بڑتی تھی جسم منور سے ضیا  
در حقیقت نور حق تھا سر سے لے کر تا پسا      واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوب خدا ایسا تو ہو

یوں تو دنیا میں ہوئے پیدا ہزاروں ابنیا      پر ہوا اب تک نہ پھر ہوگا نظیر مصطفیٰ  
نپ کو صانع نے بیشک ایک ہی پیدا کیا      واہ رے یکتائی احمد کہ سایہ بھی نہ تھا

ہو نہ جس کا مثل محبوب خدا ایسا تو ہو

دوستوں کی داد کیا اور دوستوں کی کیا پسند کیا کہا ہم نے اگر دوس پانچ کو آیا پسند  
 بات ہے وہ واقعی جسکو کرے دنیا پسند غل طرفار و زکا مجلس میں ہیں ہر ناپسند  
 خود دشمن بھی ہو باتوں میں مزا ایسا تو ہو

میرے مولا ہیں علی مرتضیٰ شیر خدا جنگے در سے ہوتی ہر شاہوئی بھی حاجت روا  
 دو جہاں میں آپ ہیں ہر ایک کے مشکل کشا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

اہل دولت سے کہوں کیا اپنے دل کا مدعا توبہ توبہ ان سے کیا ہوگی مری حاجت روا  
 دل غنی پر گرچہ میں ہوں ایک فقیر بے نوا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ہر صدا پر میری ہو کہوں کر نہ شور مچا جلتے ہو کون بھول کر کس کا ہوں محتبرا  
 لیں نہ کیونکر اہل دنیا جھکوا آنکھوں پر بٹھا ہوں در حیدر کا سائل خربے مجھ کو بجا  
 شاہ جس کی آرزو رکھیں گدا ایسا تو ہو

ناحبسوی کہ ہمیشہ چاہیے انس انکوننگ صبر وہ پیدا کرے جس سے ہوں خاص عا دنگ  
 آفت نکلے منہ سے گوہیں کو بھی ہو طابے تنگ وہیں ڈالے گوزمانہ پر چھوڑے اپنا رنگ  
 بر دباری میں بشر مثل حنا ایسا تو ہو

نہ اند شاہ کا صبر و تحمل وقت جنگ      شکر ہی نکازبان سے جب کیا اٹھانے جنگ  
ناہ فرماتے تجھے صبری سے جو انسان کو ننگ      بیس ڈالے گوزمانہ پر نہ چھوڑے اپنا رنگ

برو باری میں بشر مثلِ حنا یا تو ہو

رضی وہ ہے کہ جسکی شان میں یا ہل آئی      علم کا ہو جسکے دروازہ علیٰ بابا کا  
ہے اشجار ہونکی شاہدِ حدیثِ آفتا      خیر حق دستِ خدا میرے عربِ مشکِ لکشا

یہ لقب جسکے ہوں خویش مصطفیٰ ایسا تو ہو

پشمِ الفت سے جو ڈالی اک نظر شبیر نے      کر دیا اسرار حق سے باخبر شبیر نے  
پووتا پکڑ نہ ہوتا ہاتھ اگر شبیر نے      جاچکا تھا خر سوئے دوزخ مگر شبیر نے

راہِ جنت کی بتا دی رہنما ایسا تو ہو

مشکلِ آسان جب کے نام سے ہو بالیقین      اسکو کیا مشکل ہے جسکے علی ہوں خود معین  
وہ تمنوئی مشکلیں بھی آپ نے آسان کیں      پیش حیدر کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکِ لکشا ایسا تو ہو

ٹھہرے مشکل جب علی حائیں نظر ممکن نہیں      کھل نہ جائے عقدہ پیچیدہ یہ ممکن نہیں  
واں کریں مشکِ لکشا جس جگہ ممکن نہیں      پیش حیدر کے رہ جائے گرہ ممکن نہیں

دستِ قاتل کھول دے مشکِ لکشا ایسا تو ہو

رن میں سرکھواتے تو جا بکے جب خوش تبار کہتے تھے حضرت کہ یہ فکر ہے پروردگار  
 پاچے جس دم شہادت خود امام باوقار بیڑیاں عابثے نہیں تاہو امت رستگار  
 خلق میں پابندِ تسلیم و رضا ایسا تو ہو

دکھنے کو چرخ و قباب و حمید زار کو سب یہ اے مرزا گوارا ہے و حمید زار کو  
 اپنے مٹ جانیکا کیا غم ہے و حمید زار کو پس اے گردوں جو پیسا ہے و حمید زار کو  
 چشم بدین میں نہ کھٹکے سرمہ سا ایسا تو ہو



# ”روح کلام غالب“

اور دیگر ادبی، مذہبی، درسی غرض ہر قسم کی کتابیں  
مناسب قیمت پر

## طلب فرمائیں

تاجر حضرات کو معقول رعایت دی جائیگی

ملنے کا پتہ

## نشریات ادب ایکڈمی

بازار نخاسہ سہارنپور یوپی

## بین الاقوامی ادب کا ترجمان

نذہبی ادبی اور معلوماتی جریدہ

ماہنامہ ”دیرو حرم“ سہانپور

ہر ماہ اپنے قارئین کو نکھر استعار ادب مثلاً معیاری افسانے، مقالے  
فیچر اور بیسویں نظیں پیش کرتا ہے اور پابندی وقت کے ساتھ شائع ہوتا ہے

آپ بھی مطالعہ فرمائیں

قیمت سالانہ چھ روپے : ایک کلپی ساٹھ پیسے

نمونے کیلئے نشر پیسے کے ڈاک ٹکٹ ارسال کرنے ضروری ہیں۔

ترسیل زر کا پتہ

منیجر ماہنامہ ”دیرو حرم“ بازار نخاسہ سہانپور، پی





JAMIA COLLEGE LIBRARY

**JAMIA MILLIA ISLAMIA.**

**NEW DELHI**

161

DATE DUF

This book is due on the date last stamped An overdue charge of 10 P will be charged for each day the book is kept over-time

[illegible]

9464  
Acc. No. 40514

Class No. ۸۱۱۰۹ Book No. ۱۴

Author عزیز شیب مرزا

Title روحِ حیات کی لاشِ فاساد



## JAMIA COLLEGE LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA  
NEW DELHI-25.

1. Books have to be returned within the due date

2. Books may be renewed on request at the discretion of the Librarian.

3. Dog-earing the pages of a book, marking or writing therein with ink or pencil, tearing or taking out pages or otherwise damaging it will constitute an injury to a book

4. Any such injury to a book is a serious offence. Unless a borrower points it out at the time of issuing the book, he shall be required to replace the Book or pay its price

**Help to keep the book fresh and clean.**